دار السلام

سرآمد روزگارِ ایں فقیرے

تالیف

حضرت مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

مرتب

طارق عمیر عثمانی

دارالسلام

کتاب کا نام	سرآمد روزگارِ ایں فقیرے (مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی ؒ کے خودنوشت حالاتِ زندگی)
طبع اولیٰ	جون ۲۰۲۱ء
مرتب	طارق عمیر عثمانی
ناشر	دارالسلام اسلامی مرکز مالیرکوٹلہ
صفحات	72
ہدیۂ تعاون	

Darussalam Islamic Centre
Delhi Gate, Malerkotla
148023 Punjab India
Tel: 01675-500345, Mob: 98153 59990
Email: info@darussalam.org.in
Website: www.darussalam.org.in

ISBN 9 789354 068331

ترتیب

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیم اِز حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

خدا جانے وہ پہلے والا دور آئے گا یا نہیں
حجاز کی طرف سے ٹھنڈی ہوا چلے گی یا نہیں
اس فقیر کا وقتِ آخر آگیا ہے
اس جیسا کوئی دانائے راز آئے گا یا نہیں

(۲۱/اپریل ۱۹۳۸ء کو وفات سے چند لمحے قبل علامہ اقبال نے یہ رباعی پڑھی تھی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اول

پیدائش سے لے کر موت تک انسان نئے نئے تجربات سے گزرتا ہے اور نت نئے حالات سے دوچار ہوتا ہے...... بچپن سے لے کر جوانی تک مختلف ادوار سے ہوتی ہوئی زندگی بالآخر موت کی دہلیز تک پہنچ جاتی ہے...... انسان اپنے آخری دور میں زندگی کی اُن کھٹی میٹھی یادوں کو سمیٹتا رہتا ہے اور اس کی روشنی سے اپنی تنہائی کے اندھیرے کو دور کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے...... بڑے لوگوں کی زندگی کی یادیں بھی بڑی ہوتی ہیں...... کیوں کہ یہ یادیں اور یہ باتیں اپنے اندر عبرت و نصیحت کے بہت سے پہلو لئے ہوئے ہوتی ہیں جو دوسروں کے لئے رہنمائی کا ذریعہ بنتی ہیں......

والد گرامی مفسر قرآن حضرت مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی رحمۃ اللہ علیہ عمر بھر تصنیف و تالیف اور علمی کاموں میں مشغول رہے...... تفسیر قرآن (سات جلدیں)، اسلامی قانون کی جدید تدوین اور سیرت نبویؐ کی ترتیب جیسے اہم اور بے مثال کام انجام دیئے اور ۸۰ سے زاید کتابیں اور پچاس ہزار سے زیادہ تقاریر کی عظیم علمی وراثت چھوڑ گئے۔

یہ کتاب ''سرآمدروزگارِایں فقیرے'' والد محترم علیہ الرحمۃ نے اپنی زندگی کے

بالکل آخری دور میں بیماری کی حالت میں املاء کرائی تھی......ان کے انتقال کے وقت ہما ہمی میں یہ مسودہ کہیں گم ہوگیا تھا اور تلاشِ بسیار کے باوجود کہیں نہ مل سکا......میں ناامید ہوچلا تھا، تین چار دن پہلے اچانک پرانی فائلوں میں دبی ہوئی اس مسودہ کی فائل مل گئی......اللہ کا شکر ادا کیا اور اس کی اشاعت کا پروگرام بنانے میں لگ گیا......اس کتاب کی اشاعت کی مقصد یہی ہے کہ آنے والی نسلیں والد محترمؒ کی بیاسی سالہ زندگی کے تجربات و مشاہدات سے فائدہ اٹھا سکیں، ان سے سبق حاصل کرسکیں اور اپنی زندگیوں کے لئے صحیح سمت کا تعین کرسکیں۔

حضرت والد صاحبؒ کی وفات کے چند ماہ بعد ہی ان کی حیات و خدمات پر ایک ضخیم کتاب ''مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانیؒ ......زندگی کے تابندہ نقوش'' مرتب کرنے کی سعادت حاصل ہوئی......اللہ کے فضل و کرم سے عوام و خواص نے اس کاوش کو خوب سراہا......ملک و بیرون ملک کے نامور اہل علم حضرات اور اکابر علمائے کرام کی طرف سے تعریفی و توصیفی پیغامات کا سلسلہ ہنوز جاری ہے......اس پذیرائی سے حوصلہ پا کر زیر نظر کتاب کی ترتیب و اشاعت کا کام شروع کرنے کی ہمت ہوئی۔

حضرت والد صاحبؒ بڑی منفرد شخصیت کے مالک تھے......بھرے پُرے خاندان میں اپنی الگ ہی پہچان رکھتے تھے......نفیس ذوق، خوش لباس، پرمزاح و پُروقار اور وضع داری اور منکسر المزاجی کا حسین مرقع تھے......ایسے لوگ کم یاب نہیں بلکہ نایاب ہوتے ہیں......ان کی شخصیت واقعتاً اس شعر کا مصداق تھی:

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں

ملنے کی نہیں نایاب ہیں ہم

بوڑھی ہو چلی یہ آنکھیں ہمہ وقت اُس پُرنور چہرے کو تلاش کرتی رہتی ہیں جو

اب صرف میرے خوابوں کی زینت ہے۔ والد محترمؒ کی وصیت کا یہ جملہ ذہن کے نہاں خانوں میں گونجتا رہتا ہے کہ ''کاش تم سے حوضِ کوثر پر ملنا ہو جائے''......اور میں اُس منظر کو تصور کی آنکھ سے دیکھتا رہتا ہوں کہ ساقیٔ محشرؐ کے دست مبارک سے جامِ کوثر لیتے ہوئے اپنے ابو سے لپٹ رہا ہوں......اللہ اس لائق بنا دے!

قدرت کے رنگ بھی عجیب ہیں......تقدیر والد صاحبؒ کو دیوبند سے مالیر کوٹلہ جیسے دیارِ غیر میں لے آئی......زندگی کے پچاس سال اس شہر کی نذر کر دیئے......مالیر کوٹلہ میں کیسے کیسے طوفانوں کا مقابلہ کیا، زبردست آزمائشوں اور ابتلاء سے گزرتے ہوئے زندگی گزارنے کا ڈھنگ سکھا گئے اور بعد کی نسلوں کے لئے مثال چھوڑ گئے......مالیر کوٹلہ میں گزری ان کی زندگی اور نصف صدی پر محیط یہاں کی تلخ وشیریں یادیں اور تجربات ومشاہدات اپنے اندر رہنمائی اور عبرت کے بے شمار پہلو لئے ہوئے ہیں اور ہمارے لئے مشعلِ راہ کا کام دے سکتے ہیں...... مالیر کوٹلہ کی تلخ یادیں والد محترمؒ نے زیادہ تفصیل سے ذکر نہیں فرمائیں، اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ضعف اور پیرانہ سالی میں وہ ان تکلیف دہ باتوں کو یاد نہیں کرنا چاہتے تھے......بات نکلتی تو دور تک جاتی......

چالیس پچاس سال پہلے کا مالیر کوٹلہ آج سے بالکل مختلف تھا...... چند بالکل اَن پڑھ اور جاہل قسم کے لوگوں کا گروپ تھا جو پورے شہر پر حاوی تھا......والد صاحبؒ سے بھی یہ لوگ یہی توقع رکھتے تھے کہ وہ ان کے ماتحت ہو کر رہیں......جب اپنی امیدوں پر پانی پھرتا نظر آیا تو ان لوگوں نے شہر میں ایسا طوفانِ بدتمیزی برپا کر دیا کہ ان حالات سے میرے دل ودماغ پر جو زخم لگے وہ آج تک رِستے ہیں......والد محترمؒ تو اس بادِ مخالف کا مقابلہ کرتے ہوئے کامیاب ہوئے لیکن ان حالات کی بازگشت آج بھی میرا تعاقب کرتی ہے......اللہ کی حکمت اور اس کی مصلحت ہے یہاں سے نکلنے کی کوئی صورت ابھی

تک نہ بن سکی، پھر بھی امید کا دامن تھامے ہوئے ہوں……

دل ناامید تو نہیں، ناکام ہی تو ہے
لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے

یہ اللہ کا خاص فضل ہے کہ اس حقیر کو اپنے والد محترمؒ کی زندگی کی یادوں کو اور باتوں کو مرتب کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے……اللہ بڑا بے نیاز ہے، وہ ہر چیز پر قادر ہے، چھوٹا سا کام بھی اگر اس کی بارگاہ میں مقبول ہو جائے تو وہ اس کا بڑے سے بڑا اجر دینے کی قدرت رکھتا ہے۔اللہ تعالیٰ میری اس چھوٹی سی کوشش کو قبول فرمالے اور حوضِ کوثر پر اپنے والدین سے ملاقات کا ذریعہ بنا دے۔آمین یارب العالمین!

وماعلینا الا البلاغ۔

طارق عمیر عثمانی
دارالسلام اسلامی مرکز مالیرکوٹلہ

۱۸ر شوال المکرم ۱۴۴۲ھ
۳۰رمئی ۲۰۲۱ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سرآمد روزگارِ ایں فقیرے

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم۔

کُلُّ مَنْ عَلَیْہَا فَانٍ وَّ یَبْقٰی وَجْہُ رَبِّکَ ذُو الْجَلٰلِ وَ الْاِکْرَام

(سورۂ رحمٰن آیت ۲۵ پارہ ۲۷)

اللہ تبارک وتعالیٰ کے سوا ہر ایک کا فانی ہونا، قرآن مجید کا یہ ارشاد دنیا کی سب سے بڑی صداقت اور سب سے اٹل سچائی ہے۔

یہ حقیر عمر کے اس آخری حصے میں ہے جس کو قبر میں پیر لٹکانا کہا جاتا ہے...... ہر گزرنے والا لمحہ موت سے قریب کر رہا ہے اور ہر آہٹ پر ایسا گمان ہوتا ہے کہ شاید اللہ کا پیغام بر اس کی طرف سے پیام لے کر آ گیا ہے۔

یہ جو کچھ میں لکھوا رہا ہوں نہ سوانح حیات ہے نہ میری زندگی کے حالات ہیں......اس لئے کہ میری حیات یا میرے حالات نہ سننے کے قابل ہیں نہ سنانے کے...... کوئی بڑا آدمی ہو جس نے اپنی زندگی میں لائق ذکر کام کئے ہوں، کوئی معروف شخصیت ہو جس کے بارے میں لوگ جاننا چاہتے ہوں، اس کی سوانح حیات اور حالاتِ زندگی لوگوں کے لئے دل چسپی کا باعث ہو سکتے ہیں......ایک عام آدمی جس نے عام سی زندگی گزاری اس کے بارے میں کیا کہنا کیا سننا اور کیا اس کی ضرورت۔

میرے اس لکھوانے کا مقصد صرف یہ ہے کہ اپنی طویل زندگی میں جو دیکھا، جو تجربات ہوئے، جو سُنا اور برتا، جن کے ساتھ واسطہ پیش آیا، ان یادداشتوں کو ایک امانت کے طور پر آنے والی نسلوں کے سپرد کر دوں......شاید کوئی گوشہ کوئی پہلو اُن کے لئے نصیحت، عبرت اور فائدہ اٹھانے کا نکل آئے اور بقول شاعر......

''من نہ کردم شما قدر بکنید''

ان کے سامنے آجائے......بس اسی خیال سے یہ سطریں قلم بند کرائی جا رہی ہیں۔ جسم کی ہر طاقت سننے کی، دیکھنے کی کمزور ہوگئی ہے، یادداشت پر بھی تھوڑا بہت اثر ہے۔ اگر وقت باقی ہے تو شاید یہ تحریر اپنے اختتام کو پہنچ جائے......

ایک بھرپور زندگی

اپنی پوری زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو میں نے ایک بھرپور زندگی گزاری ہے...... غریبی، خوش حالی، محبت، پیار، نفرت، کش مکش، سفر، تجربات، مشاہدات غرض زندگی کے جتنے گوشے ہیں ان سب سے گزرتا ہوا، ان سب کا مزا چکھتا ہوا، تلخ و شیریں یادوں کو سمیٹ کر اور اپنے تمام فرائضِ حیات کی ادائیگی کے بعد پا بہ رکاب دوسری دنیا کے سفر کے لئے جسمانی اور ذہنی طور پر پوری طرح تیار بیٹھا ہوں......یعنی اگر شعر کی زبان سے کہا جائے تو یوں کہہ سکتے ہیں......

حسرتیں اب ہو چکی ہیں تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

غالبؔ کے اس دوسرے مصرعے میں مرگِ ناگہانی سے مجھے اتفاق نہیں ہے۔ میری تمنا ہے کہ مرگ ناگہانی نہ ہو۔ حدیث میں بھی مَوْتُ الْفُجَاءَۃ اچانک موت سے پناہ مانگی گئی

ہے۔کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے کہ مجھے خوب زور کا بخار ہو، بخار کی حالت میں اپنے رب کو یاد کرتا ہوا جان جان آفریں کے سپرد کردوں۔ بہرحال یہ تو ایک دعا اور تمنا کی بات ہے......موت وحیات اور اس سے متعلق تمام معاملات سب اسی کے اختیار میں ہیں جس نے ہمیں زندگی کی امانت عطا فرمائی ہے۔

بھرا پُرانا مور خاندان

دیو بند میں عثمانی خاندان کی شہرت اور وجاہت کا آغاز میرے پردادا مولانا فضل الرحمٰن صاحب سے ہوا ہے۔مولانا فضل الرحمٰن صاحب سب انسپکٹر مدارس تھے۔ فارسی کے بہت اچھے ادیب تھے اور مادۂ تاریخ نکالنے میں بڑے ماہر تھے......دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث حضرت مولانا میاں اصغر حسینؒ نے ان کو''خاقانئ ہند'' کے لقب سے یاد کیا ہے۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کے والد مولانا ذوالفقار علیؒ اور میرے پردادا مولانا فضل الرحمٰنؒ دونوں خالہ زاد بھائی تھے اور دونوں بھائیوں میں بڑی محبت تھی۔ جب مولانا فضل الرحمٰن صاحب کو دیوبند کا مدرسہ قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا تو وہ سب سے پہلے اپنے خالہ زاد بھائی مولانا ذوالفقار علی کے پاس مشورے کے لئے گئے۔دونوں کے مکان بھی قریب قریب ایک ہی محلے ابوالمعالی میں ہیں۔مولانا ذوالفقار علی نے سن کر فرمایا کہ خیال بہت اچھا ہے، چلو چل کر اپنے بزرگ حاجی عابد حسین صاحب سے مشورہ کرتے ہیں۔ چناں چہ یہ دونوں حضرات حضرت حاجی صاحب کے پاس گئے۔انہوں نے بھی تائید کی۔اوراس طرح سب کے مشورے سے دیوبند کا یہ مدرسہ جو آج دارالعلوم کے نام سے معروف ہے شروع ہوا۔

مولانا فضل الرحمٰن صاحب کواللہ نے کافی اولاد اور لائق اولاد عطا کی تھی۔انہوں نے دوشادیاں کیں۔پہلی اہلیہ سے تین بیٹے تھے:

۱) میرے حقیقی دادا مولانا مفتی عزیز الرحمٰنؒ جو دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے مفتی ہوئے۔

۲) مولانا حافظ خلیل الرحمٰن جو میرے نانا جمیل الرحمٰن کے والد تھے۔

۳) مولانا حبیب الرحمٰن جو دارالعلوم دیوبند کے پانچویں مہتمم ہوئے......دارالعلوم کی ترقی اورمرکزیت کے لئے تاحیات کوشاں رہے۔

مولانا فضل الرحمٰن کی دوسری اہلیہ سے پانچ بیٹے تھے:

۱) مولانا مطلوب الرحمٰن جوکہ مولانا عامر عثمانی کے والد بزرگوار تھے۔

۲) مولانا شبیر احمد عثمانی جوکہ دارالعلوم دیوبند کے صدر مہتمم رہے، فتح الملہم اور تفسیر عثمانی جیسی کتابوں کے مصنف مشہور عالم دین اور سیاسی قائدرہے۔

۳) مولانا محبوب الرحمٰن جوکہ مسعود جاوید اور مولانا شمس نوید عثمانی کے والد تھے۔ان کی شادی بجنور میں ہوئی تھی۔ میں نے ان کو اوران کی اہلیہ اپنی دادی کو دیکھا ہے، ہم ان کو بجنوروالی دادی کہا کرتے تھے۔

۴) بابوسعید احمد صاحب جوکہ مولانا ارشاد احمد عثمانی اور شمیم عثمانی کے والد تھے اور دارالعلوم دیوبند کے دفتر محاسبی میں محاسب تھے۔ان کی ایک لڑکی حسیبہ تھیں جن کی شادی مولانا عامر عثمانی سے ہوئی تھی ان سے ایک لڑکی ام حسیبہ پیدا ہوئی۔

۵) بابو فضل حق فضلی جو بہت عرصے تک دیوبند کے پوسٹ آفس میں پوسٹ ماسٹر رہے ان کی بیٹی آپا منی صاحبہ علامہ شبیر احمد عثمانی کی لے پالک تھیں،ان کے لاولد ہونے کی وجہ سے آپا منی کو بیٹی بنا کر پالا تھا۔میں نے بچپن میں آپا منی کو دیکھا ہے، بہت دبلی پتلی نازک

اندام تھیں، شاعرہ تھیں۔ شعروادب کا بڑا اچھا ذوق رکھتی تھیں۔ ان کے گھر میں اکثر عورتوں کی ادبی مجلسیں اور مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ تھانہ بھون کے مولانا یحییٰ صاحب سے ان کی شادی ہوئی تھی۔ ان کے بیٹے یعیش میرے ہم عمر تھے اور ہم دونوں ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ ہمارے دونوں کے مکان بھی بالکل پاس پاس تھے، دیواریں ملی ہوئی تھیں اس لئے زیادہ تر وقت دونوں کا ایک ساتھ گزرتا تھا...... مولانا شبیر احمد عثمانی کے پاکستان جانے کے بعد یہ لوگ بھی پاکستان چلے گئے اور بس یادیں باقی رہ گئیں...... میں ایک مرتبہ مدینہ طیبہ سے کراچی ہوتا ہوا آیا۔ آپا منی حیات تھیں ان سے ملاقات ہوگئی مگر یعیش امریکہ جاچکے تھے، آج تک ان سے ملنا نہیں ہوسکا۔

مولانا فضل الرحمٰن کے ان آٹھ بیٹوں کے علاوہ ان کی دو بیٹیاں تھیں۔ ایک بیٹی کا نام صدیقہ تھا جو میری نانی مرحومہ زینب معصوم کی والدہ تھیں۔ میں نے بچپن میں ان کو دیکھا ہے اور ان کے انتقال کے وقت ان کے نزع کی کیفیت آج تک میرے ذہن پر نقش ہے۔ محلہ کمہاران میں ان کے مکان میں دالان کے بیچ کے در میں ان کا پلنگ بچھا ہوا تھا اور وہ آخری سانسیں لے رہی تھیں...... یہ پہلی موت تھی جو میں نے اپنے بچپن میں دیکھی تھی...... محترمہ صدیقہ خاتون نہایت خوش ذوق اور نفیس خاتون تھیں، ان کی شادی عنایت حسین صاحب سے ہوئی تھی اور ان کے ایک لڑکے یحییٰ تھے، باقی چھ لڑکیاں تھیں جن میں ایک میری نانی بھی تھیں...... میں نے ان کی تمام چھ لڑکیوں یعنی اپنی نانی کی بہنوں کو یعنی نانیوں کو دیکھا ہے۔ یہ سب مجھ سے بہت محبت کرتی تھیں بلکہ کہا جائے کہ لاڈ پیار کرتی تھیں۔

ان میں سے سب سے بڑی خالہ اماں کہلاتی تھیں۔ ان کی شادی محلہ بڑے بھائیان میں انور صابری صاحب کے خاندان میں ہوئی تھی۔ دوسری بہن مولانا یعقوب

الرحمٰن کی اہلیہ اور مشہود الرحمٰن کی والدہ دھنو تھیں، ہم ان کو خالہ بی کہتے تھے۔ تیسری بہن کا نام ممو تھا جو مولانا راشد صاحب کے بھائی سعید صاحب کی اہلیہ تھیں، ان کے لڑکے خالد اور اختر اور دو لڑکیاں شکیلہ اور حسنی تھیں۔ چوتھی بہن کا نام بلقیس تھا ہم ان کو خالہ جی کہتے تھے، ان کی شادی داروغہ ظفر کے بھائی سے ہوئی تھی۔ ان کے بیٹے انیس، انس، شاداب الحمدللہ حیات ہیں۔ ایک بہن وافیہ تھیں جن کی شادی مسعود جاوید صاحب سے ہوئی تھی، وہ پاکستان چلی گئی تھیں اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ مولانا فضل الرحمٰن صاحب کی ایک بیٹی صدیقہ کا ذکر آچکا، دوسری بیٹی جن کا نام میرے ذہن سے نکل گیا ہے ان کی شادی سیکری میں ایک جج صاحب سے ہوئی تھی جو میرٹھ میں رہتے تھے، ان کے بیٹے سدو مجھے کچھ کچھ یاد ہیں۔

یہ ہے وہ خاندان جو کبھی بڑا بھرا پُرا تھا...... اور اب گنے چنے لوگ رہ گئے ہیں۔

پاکستان نے خاندان تقسیم کر دیئے

ہندوستان پاکستان کی تقسیم نے خاندانوں کو بھی تقسیم کر دیا...... حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ جو کہ تحریک پاکستان کے قائدین میں سے تھے اور ابتداء میں ہی پاکستان چلے گئے تھے اس لئے ہمارے خاندان کے بھی بیشتر افراد وہاں منتقل ہو گئے۔ مولانا نے ہمارے والد صاحب کو بھی بلانا چاہا تھا...... کئی روز تک ان کا بھیجا ہوا ایک ٹرک ہمارے گھر کے قریب کھڑا رہا۔ اس وقت کھوکھراپار کا راستہ کھلا ہوا تھا، اس راستے سے لوگ آزادی کے ساتھ ادھر سے ادھر آتے جاتے تھے...... مگر والد صاحب کا دل نہیں مانا اور انہوں نے جانے سے انکار کر دیا۔ دو ایک مرتبہ ملنے کے لئے پاکستان گئے۔ ملر میں ایک پلاٹ بھی غالباً ان کے نام سے حضرت قاری یعقوب صاحبؒ نے لے لیا تھا جو کہ ہمارے دادا مفتی

عزیزالرحمٰن صاحبؒ کے خلیفہ قاری محمد اسحاق میرٹھیؒ کے صاحب زادے تھے، مگر والد صاحب نے ہندوستان کی رہائش کو ہی ترجیح دی۔

ہمارے دادا کے بھائیوں میں مولانا مطلوب الرحمٰن پاکستان چلے گئے۔ ان کے ساتھ ان کے بڑے بیٹے زبیر افضل بھی منتقل ہو گئے۔ کچھ عرصہ کے بعد ان کے دوسرے بیٹے عثمان بھی چلے گئے اور پھر سب سے چھوٹے بیٹے یوسف بھی پاکستانی ہو گئے۔ یوسف میرے بچپن کے دوست تھے۔ مولانا یعقوب الرحمٰن کے بیٹے عبیدالرحمٰن اور خالو ایوب کے بیٹے پاشا ہم چاروں کی بہت دوستی تھی۔ اس کے ساتھ ہمارے دادا کے بھائی بابو سعید صاحب کے بیٹے شمیم عثمانی بھی ہماری ٹیم میں تھے۔ یوسف کے علاوہ عبید پاشا یہ بھی پاکستان چلے گئے اور شمیم اور میں بس دونوں یہاں رہ گئے۔ آخر تک ہماری دوستی اسی طرح قائم رہی یہاں تک کہ شمیم عثمانی دلی کے اینگلو عربک کالج میں پڑھاتے پڑھاتے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ شمیم عثمانی کی شادی مسعود جاوید صاحب کی لڑکی نصرت سے ہوئی تھی، ان کی ایک بیٹا شہیر عثمانی ماشاءاللہ حیات ہے۔ یوسف سے بس ایک ہی مرتبہ کراچی میں ملاقات ہوئی، وہ ناظم آباد میں رہتے تھے۔ میں ایئر پورٹ سے انہی کے گھر گیا۔ گھر کا نمبر معلوم تھا مگر وہاں جا کر پتہ لگا کہ یہاں مکان نمبر سے مکان تلاش کرنا ممکن نہیں ہے کیوں کہ مکانات ترتیب سے بنے ہوئے نہیں ہیں اور ہر ایک نے اپنے نمبر ڈال رکھے ہیں۔ میں نے ایک ترکیب نکالی، سامنے کوئلے کا ایک ڈپو تھا، وہاں جو آدمی گھروں میں کوئلہ لے جاتا تھا اس کو پیسے دئے کہ مجھے ان صاحب کے مکان میں پہنچا دو، اس مکان میں بھائی عثمان، بھائی زبیر، یوسف سب اکٹھے رہتے تھے۔ میں نے یہ نام اس کو بتائے کہ ان میں سے وہ کسی کو تو جانتا ہی ہوگا۔ اس نے کہا کہ ہاں میں ان کو جانتا ہوں اور سیدھا اس مکان میں مجھے لے گیا۔ ان لوگوں کو تعجب ہوا کہ تم کیسے پہنچ گئے یہاں تو اجنبی

لوگوں کو مکان تلاش کرنے میں بڑی پریشانی ہوتی ہے۔ میں نے بتایا کہ اس ترکیب سے آپ کا مکان فوراً مل گیا۔

بابو فضل حق فضلی جو ہمارے دادا کے سب سے چھوٹے بھائی تھے وہ اور ان کی ساری اولاد سب پاکستان منتقل ہو گئے۔

ایک دل چسپ واقعہ

ایک مرتبہ بڑا دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ وہ یہ کہ حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی صاحبؒ کی اہلیہ ہماری دادی پھول اماں اور بابو فضلی صاحب پاکستان بننے کے بعد اپنا سامان وغیرہ لینے کے لئے دیوبند آئے اور اُسی مکان میں جو حضرت علامہ کا ہمارے گھر کے برابر میں تھا اور آج بھی موجود ہے، اس میں قیام کیا۔ اس مکان کی دیواریں اتنی بلند اور مضبوط ہیں کہ اس میں چوروں کا داخلہ مشکل ہے۔ اس مکان کے دو دروازے تھے۔ ایک مین گیٹ اس کے بعد دوسرا دروازہ اور اس سے متصل گیلری کے بعد بیت الخلاء۔ چور رات کو کسی وقت اس گیلری میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ رمضان کا زمانہ تھا، سحری میں پتہ لگا کہ رات کو چوری ہو گئی اور چور سارا سامان لے گئے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ چوروں نے رات میں پھول اماں کے سرہانے رکھے ہوئے بٹوے میں سے سارے پان کھا لئے۔ صبح کو سحری میں کھانا اور پان ہمارے گھر سے گیا اور چوروں کا یہ واقعہ جس میں پانوں کا صفایا ہو گیا تھا ایک تاریخ بن گیا۔

پھول اماں ہماری دادی صاحبہ دیوبند کے قریب ایک گاؤں بچیٹی کی رہنے والی تھیں، بڑی ہنس مکھ اور دلچسپ خاتون تھیں۔ پان بہت زیادہ کھایا کرتی تھیں۔ حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی کے مزاج و مذاق سے بالکل مطابقت نہیں رکھتی تھیں، کوئی اولاد نہیں

ہوئی مگر حضرت نے ہمیشہ حسنِ سلوک رکھا۔

دھکا کس نے دیا؟

ایک روز حضرت علامہ کے اسی مکان میں گرمیوں کی دوپہر میں ہم بچے چھت پر کھیل رہے تھے......سب بچے نیچے آ گئے جن میں یعیش کے علاوہ بابو فضلی صاحب کا سب سے چھوٹا بیٹا لڈن بھی تھا، وہ بھی میرا ہم عمر تھا......میں اکیلا چھت پر رہ گیا۔ نیچے آنے کے لئے زینے پر کھڑا تھا کہ نہ جانے کس نے مجھے اتنی زور سے دھکا دیا کہ پندرہ بیس سیڑھی لڑھکتا ہوتا نیچے آ گرا......پتھر کی سیڑھیوں کا بالکل سیدھا زینہ تھا۔ میں بے ہوش ہو گیا اور ماتھے پر اتنی سخت چوٹ لگی کہ دونوں طرف دو سینگ سے اُبھر آئے جو کافی دنوں میں اچھے ہوئے اور وہ اُبھار کافی دنوں کے بعد ٹھیک ہوا......حیرت کی بات یہ تھی کہ اوپر کوئی نہ تھا......پھر دھکا کس نے دیا تھا......؟

حضرت علامہ خود اپنے مکان کا کرایہ دیتے تھے

علامہ شبیر احمد عثمانی صاحب نے جب یہ مکان بنایا تو اپنی لے پالک بیٹی آپا منی کے نام کر دیا اور جب تک وہ اس میں رہے، اس کا کرایہ دس روپے ماہوار کے حساب سے آپا منی کو دیا کرتے تھے۔

ہم نے انگریزی بولنی سیکھی

ہماری نانی صاحبہ کی ایک بہن تھیں جن کو خالہ سیدہ کہتے تھے......وہ آگرہ میں نائی کی منڈی میں رہتی تھیں۔ ان کے پہلے مرحوم شوہر سے ایک بیٹے اطہر صدیقی عرف

اچھن تھے جو بعد میں پاکستان چلے گئے تھے اور اسلام آباد میں رہنے لگے تھے۔

ہم بچپن سے ہی نزلے کے مریض رہے، رات کو سانس گھٹ جاتا تھا، ڈاکٹر نے بتایا کہ ٹانسلز بڑھے ہوئے ہیں، ان کا آپریشن ہونا ضروری ہے۔ آگرہ میں ایک مشہور کرسچین اسپتال تھا۔ میری نانی مرحومہ مجھے وہاں لے کر گئیں اور اپنی بہن خالہ سیدہ کے یہاں قیام کیا۔ مجھے کافی دن آپریشن کے لئے اسپتال میں رہنا پڑا۔ کیوں کہ اس وقت یہ آپریشن اچھا خاصا مشکل سمجھا جاتا تھا۔ اسپتال میں ہر چیز کا اہتمام بہت تھا، نرسیں بچوں کے ساتھ بہت محبت اور اخلاق سے پیش آتی تھیں، انگریزی میں بات چیت کرتی تھیں۔ ان کی دیکھا دیکھی میں بھی انگریزی کی نقل کرنے لگا۔ انگریزی تو آئی نہیں مگر لوگ کہتے تھے کہ بولتا اچھا ہے جیسے واقعی انگریز بول رہا ہو......وہ اسپتال اور خالہ کا مکان، بچپن کی وہ باتیں ابھی تک تھوڑی تھوڑی یاد ہیں۔ ان کے خالی باتھ روم میں ہم نے ایک اسپتال بنالیا تھا جس میں مختلف رنگوں کی شیشیوں میں دوائیں رکھی رہتی تھیں۔ اتنا یاد ہے کہ آگرہ بہت پچھڑا ہوا شہر تھا، صفائی بہت کم تھی، لوگ پس ماندہ اور زیادہ تر مزدور طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔

آگرے کا دوسرا سفر

چودہ پندرہ سال کی عمر میں پھر دوبارہ آگرہ جانا ہوا......اس وقت آگرہ میں ہماری نانی کی دوسری بہن رہتی تھیں جن کو خالہ چھمو کہا کرتے تھے۔ خالہ چھمو کے لڑکے ماموں خالد کی شادی میرے دوست پاشا کی بہن نجمہ صاحبہ سے ہوئی تھی۔ یہ نجمہ ہماری نانی کی نند کی لڑکی صابرہ کی بیٹی تھیں۔ ہمارے دادا حافظ خلیل الرحمٰن کے دو لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں، ایک لڑکے میرے نانا جمیل الرحمٰن تھے، دوسرے لڑکے ان کے چھوٹے

بھائی عقیل الرحمٰن تھے۔ یہ دونوں جوانی میں انتقال کر گئے تھے۔عقیل الرحمٰن کی تو شادی بھی نہیں ہوئی تھی اور جمیل الرحمٰن صاحب ہمارے نانا نائب تحصیل دار سے تحصیل دار بننے والے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا اور ہماری نانی جوانی میں بیوہ ہو گئیں۔ان کے ایک لڑکے رضی الرحمٰن تھے، وہ بھی جوانی میں انتقال کر گئے، ایک لڑکی رضیہ سلطانہ تھیں جو میری والدہ تھیں۔

حافظ خلیل الرحمٰن صاحب کی دو لڑکیاں تھیں۔ ایک لڑکی کا نام ہاجرہ تھا جن کی شادی مولانا تقی صاحب سے ہوئی تھی۔ دوسری ان کی بہن ان کا نام مجھے یاد نہیں ہے وہ صابرہ بیگم کی والدہ تھیں اور پاکستان چلی گئی تھیں۔ان کی بیٹی نجمہ کی شادی خالہ چھمو کے بیٹے خالد صاحب سے ہوئی تھی۔ نجمہ بیگم کے بھائی پاشا تھے جن سے ہماری دوستی تھی، ہم دونوں آگرہ گئے، ماموں خالد صاحب کے پاس ٹھہرے اور خوب سیر سپاٹے کئے۔اس زمانے میں تاج محل جانے میں کوئی پابندی نہ تھی اور وہ ہمارے گھر سے دور بھی نہ تھا بلکہ چھت پر سے نظر آیا کرتا تھا۔دن اور رات دسیوں بار تاج محل دیکھا، پورے چاند کی روشنی میں تاج محل کا نظارہ بڑا مسحور کن ہوتا تھا......تاج محل کے سامنے ہی قلعہ تھا، ہم نے پورے قلعے کی خوب سیر کی۔ نیچے کا وہ تہہ خانہ بھی دیکھا جہاں مجرموں کو قتل کیا جاتا تھا، پوری دیواریں خون سے بھری ہوئی تھیں۔اس وقت دیکھنے پر کوئی پابندی نہ تھی۔ میں جب اس کو دیکھ کر آیا تو ایسی وحشت ہوئی کہ شام کو بخار ہو گیا۔قلعہ کی گیلری میں انگوٹھے کے ناخن کے برابر ایک شیشہ لگا ہوا تھا جس میں پورا تاج محل نظر آتا تھا۔ کہتے ہیں کہ شاہ جہاں بیٹھ کر اس شیشے میں تاج محل کا نظارہ کرتے تھے۔اس زمانے میں فتح پور سیکری کا بلند دروازہ اور بہت سے تاریخی مقامات دیکھے۔ کافی دن ہم لوگ آگرہ میں رہے، خالد ماموں بہت خاطر تواضع کرتے تھے اور ہر جگہ گھمانے کے لئے لے جاتے تھے۔ان کا جوتا بنانے کا

کارخانہ تھا اور ہمیں یاد ہے کہ وہ اپنی والدہ کو روزانہ گھر کے اخراجات کے لئے پانچ روپے اس طرح دیا کرتے تھے جیسے آج کے زمانے میں پانچ سو روپے ہوں۔ یعنی پانچ روپے کی بھی بڑی قدر و قیمت سمجھی جاتی تھی۔ یہ وہ سستا زمانہ تھا جب ہم بازار سے اصلی گھی ایک روپے کا سولہ چھٹانک لے کر آیا کرتے تھے اور چار آنے کی گڑ کی بھیلی آتی تھی۔ آج تو ان قیمتوں کا کوئی تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

ایک بات جو اس وقت میں اور آج کے وقت میں فرق ہے کہ رشتے داروں کے یہاں جانے اور رہنے کو بوجھ نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ کوئی آئے تو بڑی خوشی ہوتی تھی اور سب بڑی محبت سے پیش آتے تھے۔ میں اپنے تائے ابا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کے یہاں ایک ایک دو دو مہینہ جا کر رہتا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ یہ بھی ہمارا ہی گھر ہے، کوئی اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا تھا...... محبت اور قربت کی یہ باتیں بس اب ذہن کی یادوں میں ہی رہ گئی ہیں۔

قرول باغ کی یادیں

میرے بچپن کا کافی حصہ دہلی میں تائے ابا یعنی ابا جان کے یہاں گزرا ہے۔ ہم سب بہن بھائی تائے ابا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کو ابا جان کہا کرتے تھے۔ ہمارے دادا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی کے دو لڑکے جن میں بڑے مفتی عتیق الرحمٰن صاحب تھے اور چھوٹے میرے والد قاری جلیل الرحمٰن صاحب تھے۔ دونوں بھائیوں کی عمروں میں خاصا فرق تھا کیوں کہ ابا جان کے بعد کئی بہنیں ہوئی تھیں جن میں ایک زبیدہ تھیں اور ایک زاہدہ تھیں۔ زبیدہ بیگم کی شادی بابو لطیف صاحب سے ہوئی تھی جن سے ایک لڑکے منیف احمد تھے اور زاہدہ بیگم کی شادی پٹواری مسعود صاحب سے ہوئی تھی جن سے ایک لڑکی صالحہ

خاتون تھیں۔ صالحہ خاتون کی شادی مفتی محمد شفیع صاحب کے بھانجے مولانا سید حسن صاحب سے ہوئی تھی۔

ہمارے والد اور تائے ابا میں بڑی محبت تھی......تائے ابا چھوٹے بھائی پر بڑی شفقت کرتے تھے،اس لئے ہم بھائیوں کے ساتھ بھی ان کا سلوک بالکل اولاد جیسا تھا۔

تایا یعنی ہمارے ابا جان بڑے وضع دار اور آئیڈیل عالم دین تھے......ان کی کچھ باتیں جو میں نے اپنے والد اور اُن سے سنی ہیں ان کی زندگی کے رخ کی عکاسی کرتی ہیں...... دارالعلوم دیو بند میں اختلافات کے بعد مولانا انور شاہ کشمیریؒ میرے دادا مفتی عزیز الرحمٰنؒ، مولانا بدر عالمؒ، تائے ابا مفتی عتیق الرحمٰنؒ، میرے ماموں رضی الرحمٰنؒ یہ پورا قافلہ ڈابھیل چلا گیا تھا اور وہاں مدرسہ تعلیم الدین میں یہ لوگ پڑھنے پڑھانے میں لگ گئے تھے۔

ڈابھیل کی ناموافق آب وہوا کے بعد جب ان کی واپسی ہوئی تو ہمارے ابا جان نے یہ کہا کہ میں ایسی ملازمت کروں گا جس میں کم سے کم تنخواہ سو روپے ہو۔ اب اس زمانے میں سو روپے تنخواہ بہت بڑی بات سمجھی جاتی تھی جب کہ عام طور پر مدرسوں میں پندرہ بیس روپے تنخواہ ہوا کرتی تھی...... دن گزرتے گئے...... پریشانیاں بڑھتی گئیں تو ہماری تائی اماں نے ابا جی سے کہا کہ بھئی دعا کرو یہ تو سو روپے سے کم تنخواہ پہ مانیں گے نہیں۔

آخر کار کلکتہ سے حاجی جان محمد نے ابا جان کو تفسیر قرآن کے لئے سو روپے تنخواہ پر بلا لیا۔ آدمی لائق تھے، حسن بیان تھا، درسِ قرآن بہت مقبول ہوا۔ حاجی جان محمد بہت بڑے تاجر تھے، ان کو بھی بڑی عقیدت ہو گئی۔ کچھ عرصے کے بعد ابا جان نے حاجی صاحب سے کہا کہ میں ایک تصنیفی اور تحقیقی ادارہ بنانا چاہتا ہوں آپ مجھے دس ہزار روپے

دے دیں۔ انہوں نے بلا تکلف دس ہزار روپے پیش کردیئے۔ یہ رقم لے کر ابا جان دہلی آ گئے......قرول باغ میں ایک کوٹھی کرائے پر لی اور ندوۃ المصنفین کی بنیاد رکھ دی۔
ندوۃ المصنفین کے معاونین میں کیسی کیسی علمی شخصیات تھیں اس پر ایک نظر ڈال لیجئے اور ابا جان کی بلند نگاہی کا اندازہ کر لیجئے......

علامہ انور شاہ کشمیری کے خاص شاگرد فیض الباری کے مصنف مولانا بدر عالم صاحب، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب، قاضی زین العابدین میرٹھی، ڈاکٹر ولی الدین اور اس طرح کے نامور حضرات اس بزم میں شامل تھے۔

کچھ عرصہ کے بعد حاجی جان محمد صاحب دہلی آئے اور کہا کہ مفتی صاحب میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ آپ نے ایک چھوٹی سی رقم کے لئے کہا ہے وہ میں نے پیش کردی، مجھے یہ امید نہ تھی کہ آپ اتنا بڑا اور اہم پروگرام بنا رہے ہیں، اب آپ بتایئے کہ ادارے کی الماریوں اور فرنیچر وغیرہ پر خرچ کا کیا اندازہ ہے؟ اس وقت ستر ہزار روپے کا اندازہ لگایا گیا اور حاجی جان محمد صاحب نے وہ رقم اپنی جیب سے خرچ کی۔

میں نے بچپن میں قرول باغ کی وہ کوٹھی دیکھی ہے۔ اس وقت وہ بڑا پوش علاقہ تھا، خوش حال لوگوں کی کوٹھیاں تھیں، چوڑی چوڑی سڑکیں اور بڑا صاف ستھرا ماحول تھا۔ بہت چوڑی سڑک کے بعد سامنے ایک پہاڑی تھی جس کو اس زمانے توڑا جا رہا تھا۔ بائیں طرف بلندی پر عیدگاہ نظر آیا کرتی تھی۔ کوٹھی میں نیچے ندوۃ المصنفین کا ادارہ تھا اور اوپر ابا جان کی رہائش تھی، جس میں ایک بہت بڑا صحن تھا۔ ابا جان کے چار لڑکے یعنی ہمارے بھائی تھے۔ بڑے مجیب الرحمٰن، ان سے چھوٹے منیب الرحمٰن، پھر عمید الرحمٰن اور سب سے چھوٹے نجیب الرحمٰن جن کو چھون کہا کرتے تھے۔ ایک لڑکی محبیہ خاتون ہیں جو اللہ کا شکر

ہے حیات ہیں، وہ تقریباً دو سال مجھ سے بڑی ہیں۔ہم سب خوب کھیلا کرتے تھے۔ بھائی مجیب صاحب تو بڑے تھے وہ ہم میں شامل نہیں تھے، باقی سب بہن بھائی خوب دھما چوکڑیاں کرتے تھے۔ ابا جان سب کو روزانہ ایک ایک آنہ دیا کرتے تھے لیکن مجھے دو آنے دیتے تھے۔عمید نے کہا کہ اس کو آپ دو آنے کیوں دیتے ہیں؟ کہنے لگے کہ بھئی یہ کبھی کبھی آتا ہے،عمید نے کہا کبھی کبھی کہاں یہیں پڑا رہتا ہے۔ ۷ ۴ء میں وہ کوٹھی لٹ گئی اور یہ لوگ بڑی مشکل سے جان بچا کر کسی کیمپ میں پہنچ گئے اور پھر جامع مسجد پر ان کی رہائش ہوگئی۔

قرول باغ کی وہ کوٹھی وہاں کی باتیں نہ جانے کیوں ذہن کے پردے پر نقش ہوکر رہ گئی ہیں......آدمی سب کچھ بھول جاتا ہے مگر اپنا بچپن نہیں بھولتا......

بچپن کی معصومانہ ہَٹ

بچپن ہی کی بات ہے، اباجی کے ساتھ قرول باغ کے مکان میں دہلی گیا ہوا تھا...... ابا جان کی کوٹھی سے تھوڑی دور پر ایک خاں صاحب رہتے تھے۔ ان کے پاس کالے رنگ کی کار تھی۔کبھی کبھی وہ ہم بچوں کو اپنی کار میں بٹھا کر سیر کرادیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ رات کو آدھی رات کے قریب میری آنکھ کھلی اور یہ ضد اور ہٹ دھرمی لگا کر رونا شروع کردیا کہ میں خاں صاحب جیسی گاڑی لوں گا، سارا گھر جاگ گیا،سب نے چپ کرانے کی کوشش کی مگر بات نہ بنی......رونا چلانا اور ضد برابر جاری رہی......سب پریشان ہوگئے۔مجبور ہوکر ابا جان خان صاحب کے پاس گئے اور ان کو بتلایا، حالاں کہ خان صاحب بڑے تیکھے مزاج کے تھے مگر ابا جان کا بہت لحاظ کرتے تھے، انہوں نے کہا کہ بچے کو لے آیئے، مجھے لے کر گئے، خان صاحب نے کہا کہ لو یہ تمہاری گاڑی ہے

اسے چلانا سیکھ لو۔ اس طرح بہلا کر مجھے چپ کرا دیا۔ میں روتے روتے غالباً تھک گیا تھا اور وہیں سو گیا۔ بچپن کی ضد اور ہٹ دھرمی کا یہ واقعہ اس بڑھے کو اب تک یاد ہے۔

چھوٹے بھائی نشاط میاں سے بچپن کی محبت

میرے ماشاءاللہ سب کو ملا کر سات بھائی اور دو بہنیں ہیں۔ مجھ سے چھوٹے کفیل الرحمٰن نشاط عثمانی تھے۔ ہم دونوں میں صرف پونے دو سال کا عمر کا فرق تھا۔

ہمارے گھر میں دو چھوٹی چھوٹی الماریاں تھیں جن کو کھڑکی کہتے تھے۔ ایک کھڑکی میں میرے کھلونے رہتے تھے اور دوسری کھڑکی میں نشاط میاں کے۔

اس زمانے میں دیوبند میں محلہ خانقاہ اور سرائے پیرزادگان، جو ذرا شہر سے فاصلے پر تھے، ایسے سمجھے جاتے تھے جیسے کوئی دوسرا شہر ہو...... ہماری نانی اماں جن کو ہم اماں جان کہا کرتے تھے، کبھی کبھی خانقاہ جایا کرتی تھیں۔ وہاں علامہ انور شاہ کشمیری، حکیم محفوظ علی صاحب اور دوسری رشتے داروں کے مکانات تھے۔ جب جانا ہوتا تھا تو سارا دن کے لئے صبح سے شام تک جانا ہوتا تھا اور ہم بھائیوں میں سے کسی ایک کو ساتھ لے کر جاتی تھیں۔

ایک روز وہ خانقاہ گئیں اور نشاط میاں کو ساتھ لے گئیں۔ مجھے اس کے بغیر سارا دن اکیلے کاٹنا مشکل ہو گیا، بہت یاد آئی۔ میں نے اپنی کھڑکی میں سے کھلونے نکالے اور کچھ اچھے اچھے کھلونے الگ کئے کہ نشاط آئے گا تو اس کو دوں گا۔ شام ہوتے ہوتے کچھ نیت بدل گئی اور الگ کئے ہوئے کھلونوں میں سے کچھ کھلونے کم کر لئے۔ ہم دونوں میں ہمیشہ بڑا تعلق رہا، علمی کاموں میں بھی وہ میری مدد کرتا تھا، بہت نیک طبیعت اور ملنسار تھا، ادبی ذوق بہت اچھا تھا۔ اس کا انتقال ہو گیا، میں اپنے آپ کو بڑا تنہا محسوس کرتا ہوں، کبھی

تو اس کے بغیر ایک دن نہیں کٹتا تھا اب عمر کاٹنی پڑ رہی ہے...... ماشاءاللہ اس کے بچے ہیں جو میرے ساتھ بڑا تعلق رکھتے ہیں۔ پچھلے دنوں میں بیمار ہوگیا اس کے بچے مجھے دیکھنے کے لئے دیوبند سے پٹیالہ آئے اور موسم کی خرابی کے باوجود پریشانی اٹھا کر سفر کیا۔ اللہ ان بچوں کو عافیت سے رکھے۔

تعلیم کا آغاز

ہمارے محلے میں گاڑا برادری کے حافظ عبدالرحمٰن صاحب رہتے تھے، انہوں نے تیلیوں والے محلے میں خان بہادر ضیاء الحق کے مکان کے سامنے ایک طبیلے میں قرآن مجید کی تعلیم کا مدرسہ کھول رکھا تھا۔ میں اور میرا چھوٹا بھائی ہم دونوں قرآن مجید پڑھنے کے لئے اس مدرسے میں جایا کرتے تھے۔ وہاں بہت میلے کچیلے بچوں کے ساتھ ہم بھی بیٹھتے تھے، پینے کے پانی کے گلاس بڑے گندے ہوتے تھے جس سے ہماری باچھیں پک جاتی تھیں۔ اس لئے گھر والوں نے ہمیں اپنے گلاس دے دئے کہ تم ان میں پانی پیا کرو۔ قاری محمد احسان صاحب ہمیں گھر پر بھی بلا کر پڑھا دیتے تھے۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ قرآن مجید کے علاوہ سب سے پہلی کتاب جو میں نے پڑھی اس کا نام ''نماز آسان'' تھا...... بھائی ممتاز صاحب کتب خانہ امدادیہ کے والد محمد علی صاحب مرحوم نے اس کی بڑی خوب صورت جلد نیلے رنگ کی بنا کر دی تھی۔ اس کے بعد یاد نہیں کہ قرآن پاک کی تکمیل کہاں ہوئی۔ والد صاحب نے شروع سے ہی مجھے خوش خطی سکھانی شروع کر دی تھی۔ پھر بعد میں میں نے منشی محبوب کریم صاحب کے یہاں کتابت مکمل کر لی۔ دارالعلوم دیوبند کے درجۂ فارسی میں دوسرے یا تیسرے سال میں مجھے داخل کرا دیا گیا۔ اس کا نصاب پانچ سال کا تھا اور فارسی اعلیٰ معیار کی پڑھائی جاتی تھی جس میں گلستاں، بوستاں، مثنوی مولانا

روم، سکندر نامہ، انوار سہیلی یہ سب کتابیں شامل تھیں، آٹھویں کے معیار کا حساب تھا، چکرورتی نام کی حساب کی کتاب نصاب میں شامل تھی۔ اس کے علاوہ اقلیدس، جغرافیہ، رقعات عالمگیری، انشاء، مضمون نگاری اور وہ تمام ضروری مضامین تھے جن کی انسان کو زندگی میں ضرورت پیش آتی ہے، بعد میں ہندی بھی شامل کردی گئی تھی۔ انگریزی ہم نے اپنے طور پر پڑھی اور علی گڑھ سے ہائی اسکول کا امتحان پرائیویٹ دیا۔

درجۂ فارسی کے ساتھی

درجۂ فارسی میں جن لوگوں کا زیادہ ساتھ رہا ان میں ایک تو مولانا خورشید صاحبؒ تھے جو بعد میں ماشاء اللہ اعلیٰ درجہ کے مدرس ہوئے۔ مفتی شفیع صاحبؒ کے بیٹے محمد رضی تھے، وہ پاکستان چلے گئے تھے۔ دارالاشاعت کے نام سے انہوں نے وہاں ایک کتب خانہ قائم کیا۔ مدینہ طیبہ میں میری ان کے ساتھ اور مولانا مفتی محمد شفیع صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ایک مرتبہ پاکستان میں بھی ان کے ادارے میں ان سے ملنے گیا۔ اس کے بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ انہوں نے میری کتاب ''اسلامی قانون'' اپنے ادارے سے شائع کی۔ ان کے بیٹے محمد اشرف نے مجھے بتایا کہ جب میں نے اباجی سے کہا کہ آپ ان سے اجازت لے لیں تو وہ کہنے لگے کہ مجھے اس سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے، وہ میرا ساتھی ہے۔ یہ ان کی محبت کی بات تھی۔ اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔

حسیب صدیقی صاحب بھی ہمارے ساتھ رفیق درس رہے، وہ مسلم فنڈ کے منیجر اور روح رواں تھے اور دیوبند کی میونسپلٹی کے صدر بھی رہ چکے تھے۔ حافظ بدرالاسلام تھے وہ دنیا سے رخصت ہوگئے۔ بڑے پرمذاق اور بذلہ سنج تھے، ان کے چھوٹے بھائی

قمر الاسلام اس وقت دار العلوم میں مدرس ہیں۔

اخلاق صاحب تھے، دیو بند کے حکیم منعم صاحب کے بیٹے اور اور مولانا فہیم صاحب کے چھوٹے بھائی تھے۔ ان کو چندہ کر کے کھانے پینے کی چیزوں کا بڑا شوق تھا، کبھی خربوزے منگوا رہے ہیں کبھی آم منگوا رہے ہیں، کبھی کوئی اور چیز مل کر کھا رہے ہیں۔ ہمیں گھر سے تھوڑے سے پیسے ملتے تھے وہی بھائی اخلاق بٹور لیتے تھے۔

ہمارے سب سے دل چسپ ساتھی فضلِ کریم تھے۔ یہ پشاور کے رہنے والے تھے، بڑے خوب صورت پٹھان تھے۔ ماشاء اللہ صحت ایسی کہ درجۂ فارسی کے سارے بچے ان سے مرعوب رہتے تھے، ہم بہت کم زور اور دبلے پتلے تھے اور ڈرتے رہتے تھے کہ ہماری کوئی پٹائی نہ کر دے کیوں کہ فارسی خانے میں یہ مار پٹائی کا پروگرام بہت چلا کرتا تھا۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ فضلِ کریم ہمارے والد صاحب کی قرأت سے بہت زیادہ متاثر ہوا اور اس نے ابا جی سے قرأت سیکھنی شروع کی۔ بس پھر کیا تھا ہمیں فضل کریم کی حمایت مل گئی اور ہم شیر ہو گئے، کس کی مجال تھی کہ ہماری طرف ترچھی نظر سے دیکھ لے۔

نہ جانے کتنے برسوں کے بعد جب ہم فارغ بھی ہو گئے تھے اچانک فضل کریم ریل میں مل گئے۔ ان میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ ماہ وسال گزرنے کے باوجود پہلے جیسے ہی تھے۔

بڑے دروازے کے رہنے والے پٹواری ابوالقاسم کے بیٹے ابوالعاصم تھے، دلی میں اینگلو عربک کے ٹیچر ہو گئے تھے۔ کافی عرصے تک ملتے رہے اب غالباً انتقال ہو چکا ہے۔

تایاجی قاری عبدالرحمٰن صاحب

ہمارے محلے میں قاری عبدالرحمٰن صاحب رہتے تھے...... یہ بھی گاڑا برادری کے تھے، اباجی سے بہت پرانی دوستی تھی، قرآن مجید بہت اچھا پڑھتے تھے۔ ہم سب ان کو تایا ابا کہا کرتے تھے، وہ اور ان کی اہلیہ ہم سب بہن بھائیوں کے ساتھ بہت محبت رکھتے تھے۔ خرچ کرنے میں بہت بخیل تھے، مگر ہم لوگوں کو عید بقرعید پر عیدی ضرور دیتے تھے۔ ان کی ایک لڑکی تھی، ان کی شادی بہت اچھے گھر میں ہوئی تھی۔ ان کے شوہر بہت پڑھے لکھے اور مہذب تھے...... برادری کا ذکر میں نے بار بار اس لئے کیا ہے کہ ہمارے سماجی تعلقات میں برادری کے لحاظ سے کوئی فرق نہ تھا، سب مل جل کر رہتے تھے۔ ہمارے محلے میں کئی طرح کی برادریاں تھیں مگر سب کے آپس میں تعلقات تھے۔

ہمارے محلے میں ایک بزرگ ہستی ''نانا'' کی تھی، وہ پورے محلے کے سرپرست تھے، کسی کو ڈانٹ دیں مار دیں، سب پر ان کا پورا پورا حق تھا۔ سارا محلہ ان کی عزت کرتا تھا اور ان کو اپنا بزرگ سمجھتا تھا۔ قصباتی زندگی میں میل جول اور بے تکلفی کا اپنا ہی رنگ تھا جو بڑا پرکشش تھا...... سب کچھ کیسا بدل گیا ہے موسم کی طرح، ہر چیز تبدیل ہوگئی ہے...... تبدیلی کو کون روک سکتا ہے۔ مگر کچھ بنیادی قدریں ہوتی ہیں ان میں ہماری تہذیب اور ہمارے افکار پروان چڑھتے ہیں۔

کھیلوں سے دل چسپی

ہمارے والد صاحب کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ تعلیم کے علاوہ ایک خاص دائرے میں ہماری کھیلوں سے دل چسپی کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ مثلاً گلی ڈنڈا، ہاکی، پتنگ اڑانا، تعلیمی تاش کھیلنا یا لوڈو کھیلنا، کیرم بورڈ یا اسی طرح کے تمام کھیلوں میں ہم حصہ لیتے

تھےلیکن اتنے وقت کے لئے کہ پڑھائی کا نقصان نہ ہو۔ ہماری نانی مرحومہ خود ہمارے ساتھ تعلیمی تاش کھیلتی تھیں، جس کا فائدہ یہ ہوا کہ ایک تو ہمارا املا ٹھیک ہوگیا دوسرے گھر میں رہنا ہمارے لئے آسان ہوگیا، وہ ہماری ساتھ اس طرح بے تکلفی سے پیش آتی تھیں جیسے یاری دوستی ہو، ہمارے ساتھ لوڈو کھیلتی تھیں، لڑائی جھگڑا بھی رہتا تھا۔ غرض وہ نانی بھی تھیں اور فرینڈ (دوست) بھی تھیں۔ اس طرح ہمارے گھر میں ہنسی خوشی کا ماحول بنا رہتا تھا۔ وہ ہمیں رشتے داروں کے بارے میں بھی بتاتی تھیں، قصے کہانیاں بھی سناتی تھیں۔ اس طرح ہم اپنے گزرے ہوئے بزرگوں سے غائبانہ طور پر متعارف ہو گئے تھے۔ حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی جو ان کے ماموں تھے ان کی باتیں اکثر بتایا کرتی تھیں۔ کئی قصے ان کے سنائے ہوئے مجھے اب تک یاد ہیں......اس اندازِ تربیت سے ہمیں بہت فائدہ پہنچا اور ہم ذہنی طور پر خاندانی روایات سے مربوط رہے۔

اماں جان کی سہیلی رابعہ خاتون......ہماری کمّا

ہماری نانی اماں جان کی ایک سہیلی تھیں جن کا نام رابعہ خاتون تھا اور ہم سب ان کو کمّا کہا کرتے تھے، وہ اماں جان کی سگی بہنوں کی طرح تھیں۔ ان کے پہلے شوہر کا انتقال ہوگیا تھا جن سے ان کے تین لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔ انہوں نے اپنے دیور سے دوسری شادی کر لی تھی، وہ نہایت بزرگ عالم دین تھے، دہلی میں مدرسہ امینیہ میں پڑھاتے تھے اور کبھی کبھی دیوبند آ کر رہا کرتے تھے۔ اوپر ایک کمرہ تھا اسی میں ان کا قیام ہوا کرتا تھا۔ کمّا خاص طور پر مجھ سے بہت پیار کرتی تھیں۔ ان کے گھر کو میں اپنا ہی گھر سمجھتا تھا۔ مجھے نہلاتی تھیں، تیار کرتی تھیں، کھلاتی پلاتی تھیں۔ ان کے لڑکے وہ بھی مجھے اپنے بچوں کی طرح سمجھتے تھے، ان کی لڑکی جن کا نام ذاکرہ تھا وہ اور ان کے شوہر قاری اظہار احمد

صاحب یہ سب میرے ساتھ بڑا تعلق رکھتے تھے۔

کمّا کے ایک بیٹے حافظ امدادالحق تھے،ان کی شادی ہماری نانی کی بہن خالہ چھمو کی لڑکی حسنی بیگم سے ہوئی تھی۔ یہ شادی کا واقعہ بھی بڑا دل چسپ ہے۔ ہوا یہ کہ ہمارے دادا کے سب سے چھوٹے بھائی فضل حق فضلی کے لڑکے تھے سلمان، دادا فضلی بھائی سلمان سے حسنی بیگم کا رشتہ لے کرآئے ،دوسری طرف حافظ امدادالحق امیدوار تھے، بڑا تناؤ پیدا ہوگیا۔ ہماری نانی اماں بیچ میں پھنسی ہوئی تھیں،ایک طرف سہیلی اوران کا بیٹا دوسری طرف ماموں اوران کا بیٹا تھا۔ پورا خاندان ایک طرف تھااورزورڈالا جارہا تھا کہ بھائی سلمان سے رشتہ ہو۔ خالہ حسنی شکل وصورت میں بہت اچھی تھیں، آخرکار ماموں امدادالحق نے بازی مارلی اوران سے شادی ہوگئی۔

میں اکثر ماموں امداد کے پاس دہلی جاکر رہتا تھا۔فراش خانے پر ان کی گھڑیوں کی دوکان تھی۔ حافظ قرآن تھے، ہروقت قرآن پڑھتے رہتے تھے،بہت صالح اورزندہ دل انسان تھے۔ مجھے اپنے ساتھ دوکان پر لے جاتے تھے، میں بازار کی رونق دیکھتا رہتا تھا۔اس زمانے میں دہلی میں ٹرام چلا کرتی تھی،فراش خانہ سے جامع مسجد تک دوآنے یاشاید ایک آنہ لگا کرتا تھا۔میں اس میں بیٹھ کرکبھی جامع مسجدآجاتا تھاجہاں تایاابا کامکان تھا،کبھی فراش خانے چلاجاتا تھا۔

ماموں امداد کے دولڑکے ہیں۔ بڑے لڑکے شمس الحق جوجامعہ ملیہ اسلامیہ میں پروفیسر تھے بڑے معروف ادیب ہیں۔ راجندرسنگھ بیدی پرانھوں نے بیدی نامہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی تھی۔

دوسرے لڑکے سلیم ہیں،ان کے بیٹے احمر سے میری بیٹی رومیٰ کی لڑکی میری نواسی یسریٰ کی شادی ہوئی ہے، یہ کنیڈا میں رہتے ہیں۔

ماموں امداد کا گھر بلی ماران میں تھا۔ جب میں وہاں جایا کرتا تھا تو چھوٹے بچے سڑک کے کنارے بیٹھے ہوئے مختلف چیزیں بیچتے ہوئے نظر آتے تھے۔ کوئی بسکٹ ٹوفی بیچ رہا ہے، کوئی چھوٹے چھوٹے کھلونے بیچ رہا ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ غریب بچے ہیں، ان پر رحم بھی آیا کرتا تھا کہ چھوٹے چھوٹے بچے کتنی محنت کررہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ مال داروں کے بچے ہیں اور پنجابی تاجر کہلاتے ہیں، ان کا طریقہ یہ ہے کہ شروع سے ہی بچوں کو کاروبار کی ٹریننگ دیتے ہیں۔ یہ اسکول سے آکر اس طرح سڑک پر چیزیں بیچتے ہیں، جب گھر جاتے ہیں تو ان سے پورا حساب لیا جاتا ہے کہ کون سی چیز کتنے میں بیچی۔ اس طرح ان کو کاروبار سکھایا جاتا ہے اور بڑے ہو کر کامیاب تاجر بنتے ہیں۔

اماں جان کے دربار سے دلہنوں کو خطابات

ہماری نانی یعنی اماں جان بڑی باذوق خاتون تھیں......ان کا طریقہ یہ تھا کہ نئی نویلی دلہنوں کو خطابات دیا کرتی تھیں۔ ماموں امدادالحق جن کو ہم بڑے ماموں کہتے تھے ان کی اہلیہ حسنی بیگم کو نگار دلہن کا خطاب دیا تھا۔ خود بڑے ماموں بھی ان کو اسی خطاب سے پکارتے تھے۔ میری اہلیہ کو سرتاج دلہن کہا کرتی تھیں اور نشاط میاں کی دلہن کو تسکین دلہن خطاب عطا ہوا تھا۔ بچے اور بچیوں کے نئے نئے بامعنیٰ خوب صورت نام رکھا کرتی تھیں۔ ان کے بعد یہ سلسلہ جاری نہیں رہا۔

وہ جوانی میں بیوہ ہوگئی تھیں، جوان بیٹے کی موت کا صدمہ اٹھایا تھا مگر انہوں نے یہ سیکھ لیا تھا کہ غم زدہ زندگی کو کس طرح خوش رہ کر گزارا جاسکتا ہے۔ وہ بڑی نفیس اور باسلیقہ اور باذوق خاتون تھیں اور بچوں کی تربیت کرنا انہیں خوب آتا تھا۔ ہم ان سے محبت بھی کرتے تھے اور ان کا رعب بھی پورا تھا۔

میں نے ایک دفعہ ان سے چارسوروپے قرض لئے، دس روپے ہر مہینے واپس کرتا تھا اور وہ خود باقاعدہ اس کا حساب رکھتی تھیں۔ آخیر میں بیمار ہوگئیں، کچھ پیسے میری طرف رہ گئے۔ میں نے کہا کہ اماں جان وہ پیسے آپ لے لیں، کہنے لگیں کہ میں نے معاف کردیئے، واپسی کی بات تو تجھے سکھانے کے لئے تھی کہ جب کسی سے لوتو اس کو واپس بھی کرو۔ زکوٰۃ بڑی پابندی سے دیتی تھیں۔ اپنے سلیقے کی وجہ سے وہ غریب ہوتے ہوئے بھی مال دار تھیں۔ مجھے ماں سے زیادہ پیار انہوں نے دیا۔ بڑی یاد آتی ہے۔

تعلیم وتربیت پر پوری توجہ

ہر طرف سے اتنے لاڈ پیار کے باوجود ہمارے والد صاحب ہماری تعلیم وتربیت سے غافل نہیں رہتے تھے......ان کا طریقہ تھا کہ پڑھائی کے وقت پڑھائی اور کھیل کے وقت کھیل۔ ہم بچوں پر لازم تھا کہ مغرب کے بعد گھر آجائیں۔ اس زمانے میں بجلی نہیں تھی۔ مٹی کے تیل کی لالٹینیں جلا کرتی تھیں۔ روزانہ لالٹینوں کو صاف کرنا ان میں تیل ڈالنا ان کی چمنیاں راکھ سے چمکانا، مغرب تک یہ کام ضروری تھا تاکہ اندھیرا ہوتے ہوتے لالٹینیں جلادی جائیں۔ مغرب کے بعد سبق یاد کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد کھانا ملتا تھا۔ گرمی کے موسم میں باہر صحن میں چارپائیاں ڈالی جاتی تھیں۔ چارپائیوں کولدوا کر لانا اور باہر جگہ پر بچھانا، یہ سب کام کرنے ہوتے تھے۔ ہینڈ پمپ بھی ہمارے گھر میں بہت دیر کے بعد لگا۔ سقہ آکر پانی بھرتا تھا اور کھانے کے وقت ٹھنڈا پانی مسجد کے کنوئیں سے لایا جاتا تھا۔ اس کام میں ہم بھائیوں میں آپس میں جھگڑا بھی ہوتا تھا، ایک کہتا تھا تم کرو دوسرا کہتا تھا کہ تم کرو۔ کسی نہ کسی کو تو کرنا ہی ہوتا تھا۔ بجلی نہیں تھی، ہاتھ کے پنکھے ہوا کرتے تھے اور کمروں میں وہ پنکھے لگے ہوئے تھے جو ڈوروں سے کھینچے جاتے تھے۔ دوپہر میں ایک آدمی اس کو

پاؤں کی حرکت سے کھینچتا رہتا تھا۔ یہ زندگی کے معمولات تھے اوراس طرح ہماری تعلیم وترتیب کا کام ہمارے بزرگ بڑی حکمت کے ساتھ کرتے تھے۔ رات کو نانی اماں کہانیاں سناتی تھیں، کبھی لوڈو کھیلتے تھے کبھی تعلیمی تاش۔زندگی بڑی خوش گوار تھی۔

خالہ ذاکرہ سے دل چسپ ملاقات

ذکر آچکا ہے کہ ہماری نانی اماں یعنی اماں جان کی سہیلی تھیں جن کا نام رابعہ تھا اور ہم سب کو ان کمّا کہا کرتے تھے۔ان کے تین بیٹے تھے، بڑے کا نام مطیع تھا، ان سے چھوٹے حافظ امدادالحق تھے اور ان سے چھوٹے شمیم احمد تھے جن کو لنگڑی بھی کہتے تھے کیوں کہ وہ ایک ٹانگ سے ذرا لنگڑا کر چلتے تھے۔ان کی ایک بہن تھیں ذاکرہ، ان کو ہم سب لالہ کہتے تھے، ان کی شادی اظہارالحق صاحب سے ہوئی تھی ، یہ پاکستان چلی گئی تھیں۔کافی سالوں بعد ایک دفعہ ہندوستان آئیں،اس وقت میں بڑا ہوگیا تھا یعنی کوئی دس بارہ سال کی عمر رہی ہوگی۔ان کے آنے کا پتہ لگا، میں نے کمّا سے کہا کہ آپ ان کو میرے بارے میں نہ بتائیں دیکھتے ہیں وہ مجھے پہچانتی ہیں یا نہیں۔ میں ان کے گھر گیا اور دروازے میں کھڑے ہوکر آواز دی۔ خالہ ذاکرہ آئیں تو پوچھنے لگیں کہ کون ہے؟ میں اندر گھسنے لگا تو کہنے لگیں کہ ارے اندر کیسے آرہا ہے، میں نے کہا میں تو آؤں گا، کہنے لگیں کون مردود ہے۔ میں نے کہا میں وہی مردود ہوں جسے آپ رگڑ رگڑ کر نہلاتی تھیں۔ پریشان ہوگئیں، پہچان نہیں پارہی تھیں۔ اچانک ان کی نظر میرے پاؤں پر پڑی، میرے بائیں پاؤں کا پنجہ پھیلا ہوا ہے۔ کہنے لگیں ارے تُو تو ہلال ہے۔ لپٹ گئیں، بہت دیر تک ہم دونوں روتے رہے۔ وہ مجھ سے اپنے بچوں کی طرح پیار کرتی تھیں۔بچپن میں جب رگڑ کر نہلاتی تھیں تو میں رونے لگتا تھا۔ان کی بہت سی باتیں میرے حافظہ میں ہیں۔

جب ہم ہاکی کھیلا کرتے تھے تو بھائی مطیع ہمارے ریفری ہوا کرتے تھے، بہت زمانے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ جب ہم دوسری دنیا میں ہوں گے تو وہاں بھی ہماری شخصیت تو یہی ہوگی، یادداشت بھی ہوگی اور ماضی کی بیتی باتیں بھی......کیا ہم وہاں سب بیٹھ کر اپنی گزری زندگی کو یاد کیا کریں گے، کیا ہمیں وہاں گزری ہوئی باتوں کا لطف آیا کرے گا، کیا یہ دنیا ہمیں وہاں بھی یاد آئے گی؟ تعلقات میں یہ محبت و پیار ہم وہاں جا کر بھول تو نہ جائیں گے!

والد صاحب کے ہمراہ بزرگوں کے یہاں حاضری

والد صاحب کا طریقہ یہ تھا کہ اکثر بزرگوں کی خدمت میں حاضری دیا کرتے تھے اور ان جگہوں پر جاتے تھے جن کا تعلق بزرگوں سے تھا۔ وہ جہاں جاتے تھے اکثر مجھے ساتھ لے جاتے تھے۔

دہلی میں حضرت دادا صاحبؒ کے خلیفہ حضرت قاری محمد اسحاق صاحبؒ پل بنگش پر رہا کرتے تھے، والد صاحب ان سے بیعت تھے۔ حضرت مولانا سید بدرِ عالم صاحب پہلے دادا صاحب سے بیعت ہوئے پھر ان کے وصال کے بعد حضرت قاری اسحاق صاحب نے بیعت ہوگئے۔ والد صاحب اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور مجھے بھی ساتھ لے جاتے تھے۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا تھا کہ ان بزرگوں کی دعائیں بھی ملتی تھیں اور ان کی خدمت میں حاضری کا طریقہ اور سلیقہ بھی آتا تھا۔

ایک مرتبہ بڑا دلچسپ واقعہ پیش آیا......وہ یہ کہ صبح کے وقت ہمارے گھر کوئی صاحب ملنے کے لئے آگئے، اس زمانے میں آنے والوں کی خاطر تواضع پان سے کی جاتی

تھی۔ ہمارے گھر میں باقاعدہ پان دان رکھا ہوا تھا جس میں کتھا، چونا، چھالیہ اور زردہ تمبا کو سب الگ الگ رکھا رہتا تھا۔ جب کسی کو پان پیش کیا جاتا تھا تو پان پر کتھا چونا لگا کر تھالی میں چھالیہ الگ اور تمبا کو الگ دکھ دیا جاتا تھا تاکہ وہ پسند کے مطابق کم یا زیادہ پان میں ڈال لے۔ تو کوئی صاحب ملنے کے لئے آئے، والد صاحب نے کہا کہ پان لے کر آؤ، میں اندر گیا، پان لگایا، تھالی میں چھالیہ اور تمبا کو الگ الگ رکھ دیا اور باہر لے کر آ گیا۔

وہ جو تمبا کو میں نے اپنے ہاتھ سے پان کے ڈبے میں سے تھالی میں ڈالا تھا اس کی خوشبو یا دھسک میرے ہاتھ میں آ گئی، دوپہر کو والد صاحب دہلی چلے گئے اور مجھے بھی ساتھ لے لیا۔ حضرت قاری صاحب کی خدمت میں پل بنگش پر حاضر ہوئے، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ رات کے کھانے میں بھنا ہوا قیمہ تھا، جب دسترخوان لگا سب کھانے لگے اور میں نے بھی روٹی کا ٹکڑا توڑ کر اس میں سالن لے کر منھ میں رکھا تو تمبا کو کی خوشبو یا دھسک کہہ لیجئے اس کی وجہ سے میں کھا نہیں سکا۔ والد صاحب نے دوبارہ میرے ہاتھ صابن سے دھلوائے مگر صابن سے دھونے کے باوجود تمبا کو کی خوشبو میری ناک میں چڑھتی رہی اور میں اپنے ہاتھ سے روٹی نہیں کھا سکا...... حضرت قاری صاحب نے کمالِ شفقت کے ساتھ مجھے اپنے پاس بٹھا کر اپنے ہاتھ سے کھانا کھلایا اور فرمایا کہ بہت ہی حساس بچہ ہے۔ حضرت قاری صاحب کی ایک ہاتھ کی چھوٹی انگلی جوڑ سے الگ ہو کر لٹکتی رہتی تھی، بعض اوقات بچے مذاق میں اس میں دھاگا باندھ دیتے تھے۔ ان کا پرنور چہرہ آج بھی نگاہوں میں گھومتا ہے۔ گھٹنوں کی تکلیف کی وجہ سے چلنے سے معذور ہو گئے تھے۔ دوسری منزل پر مکان تھا، زینے پر کپڑا بچھا دیا جاتا تھا اور وہ بیٹھ کر آہستہ آہستہ سیڑھیوں سے اُترا کرتے تھے۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ وفات سے کچھ پہلے وہ اچانک بغیر اطلاع کے

ہمارے گھر تشریف لے آئے اور تانگے سے اُتر کر اپنے پیروں سے چلتے ہوئے لمبا صحن پار کرکے اندر کمرے تک تشریف لے گئے، نہ جانے کیسے ان کی پرانی تکلیف انتقال سے کچھ دن پہلے ختم ہوگئی تھی۔ میرٹھ میں شاہ پیر گیٹ پر اکثر قیام ہوتا تھا، وہیں انتقال ہوا۔ شاہ ولایت کے قبرستان میں آرام فرما ہیں۔ ان کے پوتے قاری محمد ادریس صاحبؒ کافی عرصہ تک نئی دہلی کی جامع مسجد میں امام رہے، ان کا مزار بھی اپنے دادا کے پاس ہے۔

دیوبند کے سرائے پیرزادگان میں ایک بزرگ پیر جی صاحب رہا کرتے تھے جن کے بیٹے مولانا اسلام صاحب دارالعلوم میں مبلغ رہے ہیں، میرے ہم سبق بھی تھے۔ ان کی شادی حکیم محفوظ صاحب کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ والد صاحب ان سے بھی ملنے جاتے تھے اور مجھے بھی ساتھ لے جاتے تھے۔

سہارن پور کی مسجد فزح میں ایک عالم دین اور بزرگ رہا کرتے تھے جو علامہ انور شاہ صاحب کشمیری کے شاگرد تھے۔ اباجی ان کے پاس بھی جاتے تھے اور مجھے بھی ساتھ لے جاتے تھے۔ جب میں ان کے پاس جاتا تھا تو وہ اکثر دودھ میں سہارن پور کے پاپے ڈال کر کھلایا کرتے تھے جو مجھے بہت اچھے لگا کرتے تھے۔

سہارن پور کے گاگل ہیڑی کے قریب ایک گاؤں تھا جس کا نام شاید گوگ رکھی تھا، سہارن پور سے گاگل ہیڑی جاتے وقت داہنے ہاتھ پڑتا ہے۔ اس کی مسجد کے حجرے میں حضرت شاہ رفیع الدین صاحبؒ نے کافی دن رہ کر عبادت کی تھی۔ ایک مرتبہ اباجی مجھے اپنے ساتھ لے گئے اور کافی دیر اس حجرے میں بیٹھے رہے۔ غرض یہ ان کا معمول تھا کہ اہل اللہ اور بزرگانِ دین کی خدمت میں حاضر ہونا اور پھر مجھے اپنے ساتھ لے جا کر ان کے بارے میں بتانا۔ اسی طرح ایک مرتبہ سرہند شریف حضرت مجدد صاحبؒ کے روضہ پر آئے، اس وقت یہاں کوئی مسلمان نظر نہیں آتا تھا۔ سرہند اسٹیشن پر اترے تو ہمیں

چاروں طرف سے سکھوں نے گھیر لیا، پوچھتے رہے کہ کہاں سے آئے ہو کیوں آئے ہو۔ جب ان کو بتایا کہ ہم مجدد صاحبؒ کے روضے پر آئے ہیں تو انہوں نے بڑی عزت کی اور تانگے میں بٹھا کر رخصت کیا۔ روضہ شریف میں ابا جی خواجہ معصوم صاحبؒ کی مسجد کے ایک حجرے میں ٹھہرے اور بتایا کہ یہاں تمہارے دادا نے قیام کیا تھا۔ خواجہ صاحب کے مزار اور مسجد کے درمیان انہوں نے ایک جگہ بھی بتائی کہ تمہارے دادا نے کہا تھا کہ یہاں اللہ کی رحمت بارش کی طرح برستی ہے۔

میرٹھ میں والد صاحب اکثر قاضی زین العابدین صاحب کے پاس جایا کرتے تھے جو کہ شہر قاضی تھے، لال کرتی میں قیام کیا کرتے تھے۔ دیوبند کے بزرگ بھائی طیب صاحب کے والد مولانا آل حسن صاحب، جو نواب رشید صاحب کی کوٹھی میں رہتے تھے، ان سے ملاقات کے لئے جایا کرتے تھے اور حسب معمول میں بھی ساتھ ہوتا تھا۔ یہ ان کی تربیت کا طریقہ تھا جس کا فائدہ بعد میں محسوس ہوا۔

بوڈینہ ضلع مظفر نگر کا سفر

ضلع مظفر نگر میں بھگرے کے پاس ایک گاؤں ہے بوڈینہ، یہاں ہمارے دادا صاحب کے مرید حکیم اختر صاحب اور کچھ دوسرے لوگ رہتے تھے، وہ ہر سال والد صاحب کو اور ہم لوگوں کو بلایا کرتے تھے۔ چند دن ہم وہاں جا کر رہتے تھے۔ اکثر سردیوں میں جانا ہوتا تھا۔ کچی سڑک تھی، بگھرے سے بوڈینہ تک بیل گاڑی سے سفر ہوا کرتا تھا۔ سڑک پر بعض اوقات کیچڑ ہوا کرتی تھی، بیل گاڑی پھنس جایا کرتی تھی۔ یہاں دادا صاحب نے قرآن مجید کی تعلیم کا ایک مدرسہ قائم کیا تھا جو انہی کے نام سے ہے اور اب تک چل رہا ہے۔ اس گاؤں میں ہمارے بہت سارے بزرگ جا چکے ہیں۔ مولانا میاں

اختر حسین صاحب بھی تشریف لے گئے تھے۔ حضرت قاری اسحاق صاحب، ان کے صاحب زادے قاری یعقوب صاحب اور قاری یوسف صاحب کے بیٹے قاری ادریس صاحب یہ سب لوگ وہاں جاتے رہے ہیں۔ میں بھی کافی کافی دن جا کر رہا کرتا تھا۔ حکیم صاحب کی ایک گھوڑی تھی، وہ بہت سیدھی اور اچھی تھی، اس پر سواری بھی کیا کرتا تھا اور شام کے وقت اس پر بیٹھ کر نہر کے کنارے تفریح کے لئے جایا کرتا تھا۔

ایک مرتبہ لطیفہ پیش آیا۔ حکیم صاحب نے کہا کہ زیادہ دور مت جانا، اِدھر اُدھر لکڑ بگھا پھر رہا ہے۔ کھیتوں میں جو آدمی کام کر رہے تھے اور اونٹ جو کھیت میں تھے کہیں سے ان کی آواز آ رہی تھی، میں سمجھا کہ لکڑ بھگے کی آواز ہے، میں نے گھوڑی کو ایڑ لگا دی اور وہ بھاگ پڑی۔ تھوڑی دور جا کر دیکھا کہ وہ اونٹ کی آواز تھی، آہستہ آہستہ گھوڑی کی رفتار کم کی اور واپس آیا۔ معلوم ہوا کہ دماغ میں اگر کوئی تصور بیٹھا ہوا ہو تو آدمی یہ سمجھ لیتا ہے کہ یہ وہی ہے جو دماغ میں ہے، وہ بات دماغ میں ہوتی ہے دماغ سے باہر نہیں ہوتی۔ ڈر کی حقیقت بھی یہی ہے۔ ڈر ایک وہم کا نام ہے جو ہمارے دماغ سے باہر محسوس ہونے لگتا ہے۔ حکیم صاحب صبح کو تازہ تازہ دودھ نکال کر پلایا کرتے تھے اور رات کو دودھ میں دیسی گھی ڈال کر دیتے تھے۔ ہفتے دس دن بعد میں خوب کھا پی کر گھر آتا تھا۔ گاؤں کی سیدھی سادی بے تکلف زندگی اور چوپال میں گاؤں والوں کی سادی سادی باتیں مجھے بڑی اچھی لگتی تھیں۔ اب نہ حکیم صاحب رہے اور نہ دوسرے جاننے والے لوگ۔ چند سال پہلے شاملی سے ایک پروگرام سے لوٹتے ہوئے راستے میں بوڈینہ جانا ہوا۔ اب سڑک پکی ہو گئی ہے، کار تھی جلدی سے پہنچ گئے۔ مسجد میں جا کر وہ جگہ جہاں ٹھہرا کرتے تھے اس کو دیکھ کر میں اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکا۔ در و دیوار سے لپٹ کر روتا رہا، گزری ہوئی باتیں یاد آ رہی تھیں۔

سنگ وخشت درودیوار لپٹ کر روئے
اجنبی شہر بھی برسوں کا شناسا نکلا

یہ میرے عزیز بھائی کفیل الرحمٰن نشاط کا پیارا سا شعر ہے جو اس نے اپنے شعری مجموعہ کے ٹائٹل پر لکھا ہے۔

اساتذۂ کرام کا احترام

والد صاحب کی ہمیشہ یہ سخت تاکید رہتی تھی کہ اپنے استادوں کا احترام کرو ورنہ تمہیں علم نہیں آئے گا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ علم کے لئے ادب ضروری ہے۔

ہمارے فارسی خانے میں صدر مدرس تھے مولانا ظہیر احمد جھنجھانوی۔ وہ مجھے فارسی پڑھانے کے لئے گھر پر آیا کرتے تھے۔ والد صاحب اس وقت ان کی خدمت میں پانچ روپے مہینہ پیش کیا کرتے تھے۔ اس وقت بجلی نہیں تھی، لالٹین میں پڑھا کرتے تھے۔ وہ اکثر مغرب بعد آیا کرتے تھے۔ والد صاحب کی سخت تاکید تھی کہ ان کے آنے سے پہلے فرش بچھا کر ان کا انتظار کرو انہیں آواز دینے کی ضرورت نہ پڑے۔

سردیوں کی موسم میں، دروازے میں بیٹھک تھی، وہاں بیٹھا کرتے تھے اور گرمیوں میں ہمارے گھر کے سامنے ایک جگہ تھی جو چار دیواری سے گھری ہوئی تھی، اس لئے اس کو گھیر کہتے تھے۔ گرمی میں چادر بچھا کر گھیر میں بیٹھا کرتے تھے، چوکی پر لالٹین رکھ لیتے تھے اور استاد کے سامنے بیٹھ جاتے تھے۔

میرے ساتھ ایک اور ہمارے رشتے دار تھے جن کا نام شمیم انور تھا، وہ بھی میرے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ شمیم انور کو اس میں بڑی مہارت تھی کہ وہ موم سے بچھو بنا دیتا تھا جو بالکل اصلی لگا کرتا تھا۔

ایک دن اس نے شرارت کی، موم کا بچھو بنا کر چوکی کے نیچے رکھ دیا، تھوڑی دیر بعد میں نے شور مچایا کہ مولوی صاحب بچھو بیٹھا ہے بچھو بیٹھا ہے۔ مولوی صاحب گھبرا کے اٹھ گئے، میں اندر سے چمٹا لے کر آیا اور اس موم کے بچھو کو اصلی بچھو کی طرح پکڑ کر باہر لے جانے لگا تو میری ہنسی چھوٹ گئی۔ ہنسنے سے پول کھل گئی کہ بچھو اصلی نہیں ہے موم کا بنا ہوا ہے۔ مولوی صاحب اس شرارت پر بڑے ناراض ہوئے۔

ہمیں اس شرارت کی یہ سزا ملی کہ اگلے دن جب ہم چادر لے جانے لگے تو اس میں اصلی بچھو بیٹھا تھا۔ اس نے ہمارے پاؤں کی چھوٹی انگلی میں کاٹ لیا۔ رات بھر ہائے ہائے کرتے گزری۔ مثال مشہور ہے ''بچھو کا کاٹا روئے سانپ کا کاٹا سوئے''، کسی چیز سے آرام نہ آیا۔ صبح کو جونک لگائی گئی، اس نے سارا زہر پی لیا، تب جا کر سکون ہوا۔ آئندہ کان پکڑے کہ استاذ کے ساتھ ایسا مذاق کبھی نہ کریں گے۔

مولانا ظہیر احمد صاحب بڑے شریف انسان تھے۔ میاں جی نور محمد جھنجھانوی کے خاندان سے تھے۔ وہ دیوبند میں بہت سے گھروں میں کرایہ دار کی حیثیت سے رہے۔ اتنے شریف تھے کہ جب مالک مکان کہتا تھا فوراً مکان خالی کردیتے تھے۔ ان کی ایک بیٹی تھی شمامہ، اس کی شادی میری اہلیہ کے خالہ کے لڑکے ماسٹر منظور صاحب سے ہوئی تھی۔ پھر جب میں درجہ فارسی میں مدرس ہوا تو مولانا کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ وہ اپنے داماد کے پاس گئے ہوئے تھے کہ وہیں اچانک ان کا انتقال ہو گیا۔

ایسے ہی ہمارے ایک استاد تھے حافظ شریف صاحب۔ وہ اسلامیہ اسکول میں ٹیچر تھے، ہمیں انگریزی پڑھایا کرتے تھے۔ والد صاحب کی تاکید تھی کہ ماسٹر صاحب کے آنے سے پہلے تیار ہو کر باہر بیٹھ جاؤ ماسٹر صاحب کو آواز نہ دینی پڑے۔ اگر کبھی غفلت ہو جاتی تھی اور ماسٹر صاحب آواز دے دیتے تھے تو ابا جی بہت ناراض ہوتے تھے۔ ان

کی اس تعلیم وتربیت کی وجہ سے ہمیشہ اپنے استادوں کی عزت اوران کا احترام رہا۔ میں نے اپنے اساتذہ کی تعلق سے ایک کتاب بھی لکھی ہے جس کا نام ہے ''میرے قابلِ احترام اساتذۂ کرام''۔ میرے پاس جو کچھ بھی تھوڑا بہت علم ہے یہ ان اساتذہ کے قدموں کے طفیل ہے جن کے سامنے میں نے زانوئے ادب طے کئے ہیں۔ استاذ کا درجہ ایک لحاظ سے باپ سے بھی بڑھ کر ہے۔ اللہ تعالیٰ میرے تمام استادوں پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے، ان کو جزائے خیر دے اوران کے رتبے بلند فرمائے۔

پیّے کا بچہ

درجۂ فارسی دارالعلوم دیوبند میں جب میں پڑھتا تھا تو اپنی جماعت میں سب سے چھوٹا تھا۔ اس وقت مولانا سید حسن صاحب بھی وہاں مدرس تھے۔ وہ بڑے پُر مذاق اور ہنس مکھ انسان تھے۔ انہوں نے ہرایک لڑکے کو کوئی نہ کوئی خطاب دے رکھا تھا۔ میری کم عمری کی وجہ سے مجھے وہ پیّے کا بچہ کہا کرتے تھے کہ ایسا چھوٹا سا ہے جیسے پیّے کا بچہ ہوتا ہے۔

شیخ سعدی کی گلستان ہم نے انہی سے پڑھی تھی اوراسی درس گاہ میں پڑھی تھی جو شیخ سعدی کی یادگار میں بنائی گئی تھی۔ کسی نے خواب میں دیکھا تھا کہ سعدی یہاں بیٹھے ہوئے گلستاں پڑھا رہے ہیں، تو اس جگہ پر یہ درس گاہ بنادی گئی اوراس پر پتھر بھی لگایا گیا جس پر لکھا ہوا ہے ''یادگارِ سعدی''۔

مولانا سید حسن صاحب نے مجھے اور مولانا خورشید احمد صاحب کو فارسی میں تقریریں لکھ کر دیں کہ اس کو اچھی طرح یاد کرلو۔ ہم دونوں نے وہ تقریریں خوب یاد کرلیں اورمشق کرلی۔ دارالعلوم میں سالانہ جلسۂ انعامات بڑی اہمیت کے ساتھ ہوتا

ہے۔ تمام اساتذہ، مہتمم صاحب، شیخ الحدیث صاحب سب اس میں شرکت کرتے ہیں۔ تقسیمِ انعامات کا جلسہ ہوا تو مولانا نے اس میں ہماری تقریروں کا پروگرام رکھوا دیا۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کی زبان سے فارسی میں تقریر سب کو بہت پسند آئی، ہمیں انعامات دئے گئے۔ بڑی حوصلہ افزائی ہوئی۔

بڑی عجیب بات ہے کہ اسی درس گاہ میں میں نے برسوں گلستاں پڑھائی جہاں کبھی کم عمری میں خود پڑھی تھی۔ مجھے ہمیشہ اپنے استاد یاد آتے تھے جنہوں نے محنت کے ساتھ مجھے پڑھایا تھا۔

میرے تعلیمی مرحلے جلدی جلدی مکمل ہوتے گئے یہاں تک کہ فارسی سے فارغ ہوکر عربی شروع ہوگئی اور والد صاحب نے مجھے اس زمانے کے بہترین مدرس شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ کے سپرد کر دیا۔

شیخ الادب سے عربی تعلیم کا آغاز

حضرت مولانا اعزاز علی صاحب جو کہ شیخ الادب والفقہ کے لقب سے معروف تھے، دارالعلوم دیوبند کے اعلیٰ درجہ کے استاذ اور انتہائی مصروف انسان تھے۔ پڑھنے پڑھانے کے علاوہ نائب ناظم تعلیمات کی ذمے داری بھی ان کے اوپر تھی۔ اس زمانے میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی جو کہ صدرالمدرسین تھے وہ ناظم تعلیمات بھی تھے اور مولانا اعزاز علی صاحب اگرچہ نائب ناظمِ تعلیمات تھے مگر فی الحقیقت تعلیمات کا سارا کام وہی انجام دیتے تھے۔ ان کی مصروفیت کا عالم یہ تھا کہ دارالعلوم کی پرانی مسجد میں ایک کمرے میں ان کی رہائش تھی، جب جماعت کھڑی ہونے والی ہوتی تھی اور مولانا اپنے حجرے سے نکل کر صحن طے کرتے ہوئے جماعت میں شامل

ہونے کے لئے جاتے تھے،اس وقت بھی کسی نہ کسی کو پڑھانے کا وقت دے رکھا ہوتا تھا اوراس کووہیں پڑھاتے ہوئے جاتے تھے۔

عالم بھی تھے اور انتہائی باعمل بھی۔ ہر چھوٹے بڑے کو پہلے خودسلام کرتے تھے۔ یہ بات مشہور تھی کہ سلام کرنے میں کوئی مولانا سے بازی نہیں لے جاسکتا۔حضرت مولانا میرے داداصاحب مفتی عزیزالرحمٰن صاحب کے شاگرد تھے، اس لئے والد صاحب کا بہت احترام کرتے تھے۔والدصاحب مجھے لے کرمولانا کی خدمت میں گئے اوران سے فرمائش کی کہ آپ اس کو پڑھادیں۔تمام مصروفیات کے باوجودشاگردی کی نسبت کی وجہ سے مولانا انکارنہیں کرسکے۔اس وقت تعلیمات کا دفتر،دفتراہتمام کے پاس شمال کی جانب اُس کمرے میں تھا جس میں کافی عرصے تک ماہ نامہ دارالعلوم کا دفتر رہا۔

جیسا میں نے عرض کیا کہ میں بہت نوعمر تھا، ایک بڑے سے ڈیسک کے پیچھے ایک بارعب اورسنجیدہ شخصیت تشریف فرما تھی، میں اپنے ساتھ عربی کی پہلی کتاب میزان الصرف لے کرگیا۔اس پر حاشیہ اردو میں تھا جومولانا اشتیاق احمد صاحب نے کیا تھا اور اشتیاق بک ڈپودیوبند سے یہ کتاب چھپی تھی، میں نے وہ کتاب کھول کرسامنے رکھی، حضرت نے فرمایااس پرحاشیہ اردو میں ہے مولوی صاحب کل سے آپ فارسی حاشیے والی دوسری کتاب لے کرآئیں۔اردو حاشیے سے استعداد کمزور ہوجاتی ہے۔ چناں چہ اگلے روز میں فارسی حاشیے والی دوسری کتاب لے کرگیا۔منشی عزیز صاحب دفترتعلیمات میں معتمد تھے، ان کے بیٹے محمدحسیب فارسی میں میرے ساتھی تھے، جب میں مولانا سے پڑھنے لگا تو محمدحسیب اورخورشید عالم صاحب جو کہ مولانا غیوراحمدصاحب کے صاحب زادے تھے اوردرجہ فارسی میں ہمارے ساتھی تھی وہ بھی شامل ہوگئے۔اس طرح ہماری تین طلباءکی جماعت بن گئی۔ مولانا کبھی حدیث کے سبق کے بعد دارالحدیث میں

پڑھاتے تھے،کبھی کمرے میں پڑھاتے تھے،کبھی کسی اور کتاب کے سبق کے بعد کسی درس گاہ میں بلا لیتے تھےلیکن سبق کبھی ناغہ نہیں ہوتا تھا۔نہایت پابنداورعلم دوست شخصیت تھی۔

بچپن تو بچپن ہوتا ہے۔کچھ نہ کچھ شرارتیں بھی ہوتی ہیں۔مولانا کے کمرے کی کھڑکی سڑک پر کھلتی تھی۔ایک مرتبہ کہیں پتنگ کے پیچھے بھاگتے ہوئے دیکھ لیا،اگلے دن تنبیہ فرمائی،سر پر ہلکے ہلکے چپت لگاتے جاتے اورفرماتے جاتے کہ''مولوی صاحب''،یہ ان کا تکیہ کلام تھا،آپ پتنگ لوٹتے ہیں میں آپ کے دادا کو کیا جواب دوں گا۔تب ہمیں پتہ چلا کہ دراصل یہ ساری عنایتیں دادا صاحب کی نسبت سے ہیں۔اسی زمانے میں ان کی اہلیہ محترمہ کی وفات ہوگئی،ہم نے سوچا کہ آج تو چھٹی رہے گی،تینوں نے کھیلنے کا پروگرام بنالیا،کھیل شروع بھی نہیں ہوا تھا کہ چپراسی آ گیا کہ حضرت بلارہے ہیں سبق پڑھ لو۔

اب یہ ہماری بے ہودگی اوربچپن کی بات ہے کہ ہمارے منھ سے نکلا بڑے میاں کوآج بھی چین نہیں ہے۔بڑے میاں تو اب ہم ادب سے کہہ رہے ہیں غالباً بڈھا ہی کہا ہوگا۔اس وقت کہاں اندازہ ہوتا ہے کہ استاد کی یہ سختی ہزاروں شفقتوں سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔اللہ ان پر اپنی رحمتیں نازل کرے۔

ہم تینوں میں سے سب سے زیادہ پڑھنے میں ہوشیار خورشید عالم تھے،جب ہم چھوٹی کتابوں سے متوسط کتابوں پر آ گئے تو ہمارے اوران کے درمیان دوڑ لگی رہتی تھی جس میں زیادہ تر وہی آگے نکلتے تھے۔

ایک مرتبہ ہم نے ہاتھ مارا اورقدوری وغیرہ میں پچاس سے زیادہ نمبر لے کر خصوصی انعام کے مستحق ہوگئےمگر اسی کے ساتھ ایک چوک ہوگئی۔منطق کا ایک چھوٹا سا رسالہ تھا عیسیٰ غوجی،اس کا امتحان مولانا معراج صاحب کے پاس تھا،ہم نے اس کو

ڈھنگ سے پڑھا نہیں، مولانا معراج صاحب نے اس میں فیل کردیا اور ہمارا خصوصی انعام دھرا رہ گیا۔ جلسۂ تقسیم انعامات میں حضرت شیخ الادب صاحبؒ نام اور کتابوں کے نمبر پڑھ کر سنا رہے تھے، جب ہمارا نام آیا تو کتابوں کے نمبر سناتے ہوئے حضرت کا چہرہ خوشی سے کھل رہا تھا، اچانک عیسیٰ غوجی پر پہنچ کر دیکھا کہ فیل ہیں تو کھلا ہوا چہرا مرجھا گیا اور صاف معلوم ہوگیا کہ جیسے زبانِ حال سے کہہ رہے ہوں اس چھوٹی سی کتاب کو بھی پڑھ لیا ہوتا۔

شیخ الادب صاحب کا طرزِ تعلیم

حضرت شیخ الادب صاحب کا طرزِ تعلیم بڑا دل نشیں تھا۔ وہ قواعد کو مثالوں میں ادا کراتے تھے۔ پڑھاتے ہوئے ہاتھوں سے بھی بامعنیٰ اشارے کرتے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے ہمیں پڑھایا کہ واؤ ''مع'' میں بھی آتا ہے، اور پھر مثال دی کہ **جَاءَ الْبَحْرُو وَالجُبّارۃ** آیا جاڑا مع لحافوں کے، اور پھر یہ پڑھاتے ہوئے ہاتھوں سے بھی اشارہ کیا کہ جاڑا رضائی اور لحاف لے کر آرہا ہے۔

ہمارے ساتھ ایک بنگالی طالب علم بھی شامل ہوگئے تھے، غالباً ابوالقاسم نام تھا اور ہمیں ایک کھلونا مل گیا تھا۔ بنگالی بہت دیر میں اردو سیکھ پاتے ہیں، مذکر مؤنث کا فرق نہیں کرتے۔ شیخ الادب صاحب نے پڑھایا کہ واؤ مذکر غائب کے صیغے میں ہوا کی ضمیر پوشیدہ ہوتی ہے جیسے **فَعَلَ** (اس نے کیا) یہاں ہُوا چھپا ہوا ہے، **یَفْعَلُو** اوہ کرتا ہے، اس میں ہوا کی ضمیر پوشیدہ ہے۔ اب جب بھی واحد مذکر غائب کا صیغہ آتا تھا ابوالقاسم یہ کہنے سے نہیں چوکتے تھے کہ حضرت اس میں ضمیر ہوا کی۔ شیخ الادب صاحب جھلا کر کہتے تھے ہاں بھئی اس میں ضمیر ہوا کی چھپی ہوئی ہے۔ ایک مرتبہ کتاب کا صفحہ پھٹا ہوا تھا اور غائب کے صیغے کے نیچے دوسرے صفحے پر لکھی ہوئی ہوا کی ضمیر نظر آگئی، ابوالقاسم فوراً کتاب لے

کر شیخ الادب صاحب کی خدمت میں پہنچے، حضرت اس میں ضمیر ہوا کی جو پوشیدہ تھی وہ غائب ہوگئی۔ حضرت نے فرمایا گدھے یہ دوسرا صفحہ ہے، پوشیدہ کا مطلب یہ نہیں کہ وہاں کوئی چیز چھپی بیٹھی ہے اور یہاں نکل آئی۔ غرض ابوالقاسم کے آنے سے ہماری جماعت خاصی پر لطف ہوگئی تھی۔

ہمیں شیخ الادب جیسے کامل استاذ ملے مگر ہم ہی ان سے پورا فائدہ نہ اٹھا سکے۔

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی تھا

رحمۃ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

شیخ الادب صاحب کی دولت سے بے نیازی

جس زمانے میں حضرت شیخ الادب صاحب کو دارالعلوم دیوبند سے بہ مشکل پندرہ یا بیس روپے ماہانہ مشاہرہ ملتا تھا، اسی زمانے میں سر محمد شفیع صاحب نے دلی کالج میں پروفیسر ادب عربی کے لئے پیش کش کی اور شیخ الادب صاحب کو لکھا کہ ہم آپ کو ایک ہزار روپے ماہانہ مشاہرہ دیں گے، رہنے کے لئے کوٹھی ہوگی اور فلاں فلاں سہولتیں دی جائیں گی۔

اب آپ خیال کیجئے کہ ایک طرف بیس روپے ماہانہ دوسری طرف ایک ہزار روپے ماہانہ اور دوسری تمام سہولتیں۔

ہمارے آج کل کے حضرات توجہ کریں اور دیکھیں کہ ہمارے ان بزرگوں نے کس طرح دین کی خدمت کی ہے اور اس کے لئے اپنے راحت و آرام کی قربانی دی ہے۔

شیخ الادب صاحب نے اس پیش کش کے جواب میں لکھا کہ آپ کا بہت بہت

شکریہ۔بس اب تو میرا دل چاہتا ہے کہ میں چٹائی پر بیٹھا رہوں۔

کیا عشق نے سمجھا ہے کیا حسن نے جانا ہے
ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے

حاجی عزیز حسن گنگوہیؒ

درجۂ فارسی کے ہمارے استادوں میں سے ایک بہت ہی اچھے استاذ حضرت حاجی عزیز حسن گنگوہیؒ تھے۔ان کے سپرد دارالتربیت کا بھی انتظام تھا جس میں تھوڑے سے بچے ہوا کرتے تھے۔حضرت حاجی صاحب نہایت ہی نیک صالح، متقی اور محنتی استاد تھے۔ بڑی محنت سے پڑھاتے تھے۔املاء لکھوانے کی طرف خاص توجہ تھی۔ایک ایک شو شے پر نظر رکھتے تھے۔ایسے ایسے موٹے موٹے الفاظ لکھوانے کی مشق کرواتے تھے کہ آج اس کا شاید ہی کوئی خیال رکھتا ہو۔مثلاً لکھواتے تھے قسطنطنیہ، اس طرح اور دوسرے مشکل الفاظ لکھنے کی مشق کرایا کرتے تھے۔شروع میں تختی لکھوایا کرتے تھے جس سے تحریر صاف ہوجاتی تھی، پھر انشاء کی مشق کراتے تھے درخواست لکھنا، خط لکھنا، کسی خاص موضوع پر مضمون لکھنا وغیرہ۔

میں عمر میں بہت چھوٹا تھا اور نازک اندام بھی تھا مگر حاجی صاحب کے یہاں معافی کا کوئی خانہ نہ تھا۔غلطی ہوجاتی تو پٹائی کرتے اور کہتے تھے بڑا آیا ناز پروردہ۔کسی وقت میرے منھ سے جملہ نکلا ہوگا کہ مجھے کیا خبر، سزا دیتے ہوئے اسے دہراتے تھے کہ کہتا ہے مجھے کیا خبر۔

ان کی سختی دراصل میرے لئے بہترین تربیت کا ذریعہ بن گئی۔الحمدللہ املاء اور انشاء دونوں مضمون اچھے ہوگئے۔

قابل ذکر ہے کہ ان کی ضعیفی کے بعد جب وہ سبکدوش ہو گئے تو حضرت قاری محمد طیب صاحب نے ان کی جگہ مجھے مدرس بنا دیا اور جس درس گاہ میں میں نے تعلیم حاصل کی تھی، اب میں معلم بن کر خدمت کرنے لگا۔

حاجی عزیز حسن صاحب کی ایک عجیب ادا تھی کہ وہ کاغذ کے کسی ٹکڑے کو جو قابل استعمال ہو ضائع نہیں کرتے تھے۔ اس کو اپنے پاس رکھ لیتے تھے اور جب لکھنے کی ضرورت ہوتی تھی تو اس کو کام میں لاتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ کی نعمتوں کو ضائع نہیں کرنا چاہئے، ان کی قدر کرنی چاہئے۔ وہ دراصل ان قدروں کے امین تھے جن کو دیکھنے کے لئے اب آنکھیں ترستی ہیں۔

درجاتِ عربی میں تعلیم

درجۂ فارسی سے فارغ ہونے کے بعد عربی کی ابتدائی تعلیم شیخ الادب صاحب سے حاصل کی۔ اس کے بعد درجاتِ عربی میں داخلہ لے لیا یہاں تک کہ مشکوٰۃ شریف تک جس کو ہمارے مدرسوں کی اصطلاح میں ''موقوف علیہ'' کہا جاتا ہے، پہنچ گیا۔ موقوف علیہ کا مطلب یہ ہے کہ آخری سال دورۂ حدیث اس پر موقوف ہوتا ہے اور اس کے بعد دورۂ حدیث میں داخلہ ملتا ہے۔ مشکوٰۃ یعنی موقوف علیہ تک پڑھنے کے بعد کیا ہوا یہ بڑا دلچسپ اور سبق آموز واقعہ ہے جس کو میں نے اپنی کتاب ''میرے قابلِ احترام اساتذۂ کرام'' میں بیان کیا ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ ہم نے اپنی والدہ کے ذریعے یہ اعلان کر دیا کہ اب ہم مولوی بننا نہیں چاہتے، کسی کالج میں پڑھنا چاہتے ہیں۔ جب یہ بات والد صاحب کے کانوں تک پہنچی تو انہوں نے بجائے مخالفت کرنے کے کہا کہ ٹھیک ہے تم جیسا کرنا چاہو کر سکتے ہو۔ یہ کہہ کر انہوں نے ہمیں تو مطمئن کر دیا۔ رمضان کی

چھٹیاں گزر گئیں، مدرسہ کھل گیا۔ والد صاحب نے خاموشی کے ساتھ ہمارا داخلہ فارم بھرا اور دورۂ حدیث کی کتابوں کا خوب صورت سیٹ کتب خانے سے منگوا کر گھر کے دالان میں تخت پر رکھ دیا۔ جب ہم نے کتابیں دیکھیں تو والد صاحب نے کہا کہ ان کو دیکھ کر پریشان مت ہو، تمہیں تو اب مدرسے میں پڑھنا نہیں ہے کالج میں پڑھو گے مگر یہ کتابیں سارا سال یہاں رکھی رہیں گی، ہم ان کو دیکھا کریں گے اور یاد کریں گے کہ اگر تم پڑھتے تو یہ کتابیں پڑھتے۔

ہم ان کی اس بات سے بڑے حیران ہوئے۔ شوال میں جب تعلیم شروع ہوئی تو والد صاحب نے مجھے اپنی درس گاہ میں بلایا اور کہا کہ ابھی تھوڑی دیر کے بعد حضرت مولانا حسین احمد مدنی بخاری شریف کا درس شروع کرائیں گے، اگر تمہیں کوئی گرانی محسوس نہ ہو تو بغیر کتاب لئے ویسے ہی جا کر ان کے سبق میں بیٹھ جاؤ، بہت دور دور سے لوگ ان سے پڑھنے کے لئے آتے ہیں تمہارے تو گھر میں ہی نہر بہہ رہی ہے۔

ہم نے سوچا کہ والد صاحب ہماری ساری باتیں مان رہے ہیں چلو ہم ایک بات ان کی بھی مان لیتے ہیں۔

یہ سوچ کر بغیر کتاب لئے دارالحدیث تحتانی میں جہاں مولانا مدنی سبق پڑھا رہے تھے جا کر بیٹھ گئے۔ اتفاق سے جگہ ملی بالکل مولانا مدنی کے چہرے کے سامنے۔

تھوڑی دیر کے بعد مولانا نے درس شروع کیا، پہلے خطبہ پڑھا۔ ان کی آواز بہت بلند تھی، پھر حدیث کی قرأت کی۔

ہمیں ایسا لگا جیسے مولانا ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہے ہوں۔ بس وہ ایک لمحہ تھا جس نے ہمارے دل کی دنیا زیر وزبر کر دی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ میرے اور مولانا کے علاوہ دارالحدیث میں کوئی نہیں ہے۔ ایک عجیب سا سماں تھا۔ تھوڑی دیر کے

بعد میرے دل کا سارا غبار آنسوؤں کے ساتھ بہہ گیا اور میں وہاں سے یہ ارادہ کر کے اٹھا کہ اب مجھے یہیں پڑھنا ہے۔

ابا جی سے جا کر کہا، وہ تو اسی انتظار میں تھے، خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے۔ ہمارے لئے مسجد میں کمرے کا انتظام ہوا، یہ وہی حجرہ تھا جس میں کبھی تائے ابا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب پڑھنے کی زمانے میں رہا کرتے تھے۔

اب کیا کہیں کیسے کہیں کہ پورا سال اسی سرمستی میں گزرا۔ اس سال دورۂ حدیث میں دوسو ساٹھ طلباء تھے۔ یہ ۱۹۵۶ء ۱۳۷۶ھ کی بات ہے۔

والدین کی شفقتوں اور استادوں کی احسانات کا کیا بدل ہوسکتا ہے۔ اللہ ان کی قبروں کو منور فرمائے اور ان کو جنت کے اعلیٰ مراتب عطا فرمائے۔

دورۂ حدیث سے فراغت کے بعد

دورۂ حدیث سے فراغت کے بعد میں نے مفتی مہدی حسن صاحبؒ سے فتاویٰ لکھنے کی مشق کی اور جامعہ ازہر کے اساتذہ شیخ عبدالمنعم النمر اور شیخ عبدالعال العقباوی سے عربی زبان وادب کی تعلیم حاصل کی...... والد صاحب نے ایک کتب خانہ، کتب خانہ محمودیہ کے نام سے قائم کر رکھا تھا، اس میں میں بھی بیٹھتا تھا، کتابت سیکھ رکھی تھی۔ چھوٹا موٹا کتاب کا کام بھی کرتا رہتا تھا۔ بائنڈنگ سیکھ لی تھی، جلد سازی بھی کر لیا کرتا تھا۔

والد صاحب نے مجھے کبھی خالی نہیں رہنے دیا۔ دار العلوم میں چھوٹی موٹی عیوضی مل جاتی تھی یعنی پڑھانے کے لئے چھوٹی موٹی جگہ، مہینے بیس دن کے لئے کوئی چھٹی پر جاتا تھا، اس کی جگہ کام کرنے کو رکھ لیا جاتا تھا۔ اس طرح ابتدائی درجات شعبۂ دینیات میں کام کا تھوڑا تھوڑا تجربہ ہوتا چلا گیا۔

ایک دن کی بات ہے کہ میں کتب خانہ محمودیہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک عابداللہ غازی آگئے...... یہ مولانا حامدالانصاری کے بڑے بیٹے ہیں، آج کل امریکہ میں ہیں اور میرے بچپن کے ساتھی ہیں۔

کہنے لگے اب کیا کررہے ہو؟

میں نے بتایا کہ دارالعلوم سے فارغ ہوگیا ہوں، خالی وقت میں کتب خانے میں بیٹھ جاتا ہوں۔

کہنے لگے کہ اٹھو میرے ساتھ دلی چلو۔ مجھے اٹھا کر دلی لے گئے۔ وہ نئے نئے جامعہ ملیہ میں لیکچرار ہوئے تھے۔ لے جاکر میرا اسپیشل کلاس میں جو مدرسوں کے فارغین کے لئے خاص طور پر قائم کی گئی تھی، داخلہ کرادیا۔ ہوسٹل بھی مل گیا، کئی اسکالرشپ دلوادیں اور ہر طرح کی سہولتیں ان کے ذریعے حاصل ہوگئیں۔ اس وقت جامعہ ملیہ کے سامنے صرف دو دو کانیں تھیں، ایک چائے کی تھی اور ایک پان وغیرہ کی تھی۔ اس کے علاوہ کوئی آبادی نہ تھی۔ نیا ہوسٹل بنا تھا، طلباء کی تعداد بھی زیادہ نہ تھی۔

ایک صاحب انگریزی کے استاد تھے۔ انہوں نے مجھے خاص طور پر کہا کہ میں تمہیں بہت جلد انگریزی پڑھا دوں گا۔ ان سب کاموں سے فارغ ہوکر ہم نے عابداللہ سے کہا کہ گھر سے سامان لے آئیں۔ کیوں کہ جلدی میں آئے تھے اور تھوڑے بہت کپڑے ہی لے کر آئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ٹھیک سامان لے کر آجاؤ

دیوبند آکر مدرسے میں پھنس گئے

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کبھی کبھی نانی مرحومہ سے ملنے کے لئے گھر تشریف لایا کرتے تھے۔ مجھے دہلی سے آئے ہوئے شاید ایک دو دن ہی ہوئے تھے کہ

حضرت قاری صاحب تشریف لے آئے۔حسبِ معمول گھر کی باتیں کرتے رہے، میں بھی پاس بیٹھا ہوا تھا۔اچانک میری طرف متوجہ ہوکر فرمایا ''میاں ہلال کیا کررہے ہو؟''

میں نے عرض کیا حضرت دارالعلوم سے فارغ ہو چکا ہوں، عابداللہ غازی مجھے جامعہ ملیہ میں داخلے کے لئے دہلی لے گئے تھے، وہاں اسپیشل کلاس میں داخلہ مل گیا ہے، اب سامان لینے کے لئے آیا ہوں۔

فرمایا اچھا ہے انگریزی تعلیم بھی آنی چاہئے۔ یہ امتحان توتم پرائیویٹ بھی دے سکتے ہو۔ایسا کروکل سے درجۂ فارسی میں پڑھانے کے لئے آجاؤ۔حاجی عزیزحسن صاحب پیرانہ سالی کی وجہ سے سبکدوش ہورہے ہیں،تم کل سے ان کی جگہ پڑھانا شروع کردو۔

میں بڑا حیران ہوا۔کئی طرح کے عذر کئے، حضرت ابھی تو داڑھی بھی نہیں آئی ہے، پڑھنا چاہتا ہوں۔

فرمایا کہ داڑھی بھی اپنے وقت پرآجائے گی،آدمی ساری عمر پڑھتا ہی رہتا ہے، پرائیویٹ امتحان دے دو۔

میں نے عرض کیا کہ حضرت وہاں ناظم تعلیمات مولانا ابراہیم صاحب ہیں وہ بڑے خشک آدمی ہیں۔

فرمایا کہ تمہیں ان سے کیا،تم صبح کو میرے پاس آجانا۔

غرض کوئی عذر نہ چلا اور بہت تھوڑی سی عمر میں مدرس کے طور پر کام کرنے لگا۔

عجیب واقعہ

اس کے بعد ایک دن بڑا عجیب واقعہ پیش آیا۔ میں مدرسے سے آکر کتب خانہ محمودیہ میں بیٹھا ہوا تھا، اتنے میں اباجی بھی وہاں آگئے اور کاروبار سے متعلق کچھ باتیں

فرمانے لگے۔اچانک بات کرتے کرتے ابا جی کہنے لگے کیا تم حج کرنا چاہتے ہو؟

میں اس غیر متعلق جملے پر بڑا حیران ہوا۔ میں نے کہا کہ حج تو ہر مسلمان کی تمنا ہوتی ہے،مگراس وقت تو کوئی ذریعہ نہیں ہے،آپ کو کیسے خیال آیا؟

کہنے لگے کہ بس ویسے ہی خیال آ گیا۔

چند دن گزرے تھے کہ سعودی سفارت خانے سے دارالعلوم میں ایک خط آیا۔ خط عربی میں تھا۔ ناظم صاحب نے میرے پاس بھیج دیا کہ اس کا ترجمہ کر کے دے دو۔ میں نے ترجمہ کر کے دفتر کو بھیج دیا۔ دوپہر کے کھانے پر میں نے ابا جی سے ذکر کیا کہ سعودی سفارت خانے سے ایک خط آیا تھا، ناظم صاحب نے اس کا ترجمہ کرا کے منگوایا تھا وہ میں نے بھیج دیا ہے۔اس میں لکھا تھا کہ مدینہ منورہ میں کوئی یونیورسٹی قائم ہو رہی ہے، اپنے یہاں سے دو طلباء کو منتخب کر کے بھیج دیا جائے۔

ابا جی نے کہا کہ تم بھی جانے کے لئے درخواست دے دو۔

میں نے کہا وہ تو طلباء کو بلا رہے ہیں۔

کہنے لگے کوئی بات نہیں تم بھی طالب علم ہی ہو۔

میں نے ظہر کے بعد دفتر تعلیمات میں جا کر درخواست دے دی۔ دفتر نے جن لوگوں کے دورۂ حدیث میں نمبر زیادہ تھے ان کو منتخب کر لیا، اس میں ایک نام میرا آ گیا اور دوسرا رشید الوحیدی صاحب کا۔ ہم دونوں کے نام سفارت خانے کو چلے گئے اور کچھ دن بعد وہاں سے بلاوا آ گیا کہ جلد سے جلد ان کو بھیج دیا جائے کیوں کہ سال شروع ہو چکا ہے۔

دارالعلوم نے تاواپسی ہماری رخصت منظور کر لی اور ہم مدینہ منورہ جانے کی تیاری میں لگ گئے۔

سفر کی دشواریاں

سب سے بڑا مرحلہ انٹرنیشنل پاسپورٹ کا سامنے آیا۔ ہمارے پاس پاسپورٹ نہیں تھا اور اتنی جلدی پاسپورٹ بننا بڑا مشکل تھا۔فوری طور پر پاسپورٹ ملنے کی ایک کی صورت تھی کہ کوئی فرسٹ کلاس مجسٹریٹ تصدیق کردے کہ میں اتنے سال سے ان کو ذاتی طور پر جانتا ہوں۔اس صورت میں انکوائری کی ضرورت نہ ہوگی اور پاسپورٹ فوراً مل جائے گا۔

ابا جی مجھے لے کر سہارن پور گئے۔ وہاں ایک فرسٹ کلاس مجسٹریٹ مسلمان تھے، ان سے کوئی جان پہچان نہ تھی۔ان کے سامنے پیش ہوئے۔جب انہوں نے ابا جی اور مجھے دیکھا تو فوراً تصدیق کردی اور کوئی سوال بھی نہیں کیا۔وہ فارم لے کر میں فوراً لکھنؤ گیا اور پاسپورٹ آفس میں جمع کرایا۔معلوم ہوا کہ اگلے دن پاسپورٹ مل جائے گا۔

جب اگلے دن پاسپورٹ تقسیم کئے جارہے تھے تو میرا نام نہیں پکارا گیا۔ میں پاسپورٹ آفیسر کے کمرے میں گیا اور ان سے کہا کہ میرا نام نہیں پکارا گیا، مجھے پاسپورٹ نہیں ملا۔ان آفیسر کے نام سے ساتھ یادو لگا ہوا تھا، یادو صاحب کہنے لگے کہ پاسپورٹ کیا ہم تو آپ کو گرفتار کرائیں گے، آپ نے دھوکا دیا ہے۔آپ نے پاکستانی پاسپورٹ ہلال عثمانی کے نام سے بنوایا ہے، اب انٹرنیشنل پاسپورٹ فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی کے نام سے بنوا رہے ہو، یہ دھوکہ دہی کا معاملہ ہے۔

میں نے کہا کہ اگر دھوکا دینا ہوتا تو میں فارم کے ساتھ پاکستانی پاسپورٹ جمع نہ کراتا، اصل میں میری عرفیت ہلال ہے، گھر میں مجھے اسی نام سے پکارا جاتا ہے اور مدرسے میں میرا نام فضیل الرحمٰن لکھا ہوا ہے۔میں نے پاسپورٹ اس وقت اپنی عرفیت کے نام سے بنوالیا تھا مجھے پتہ نہیں تھا اور میں نے اسے کبھی استعمال بھی نہیں کیا۔

انہوں نے میری دلیل تو مان لی مگر کہا کہ ڈاک سے تمہارا پاکستانی پاسپورٹ واپس بھیجا ہے، تم دیوبند کے ڈاک خانے سے لکھوا کر لاؤ کہ تم اسے واپس کر دو گے وصول نہیں کرو گے۔

میں نے کہا کہ جناب وقت بہت کم ہے، آپ یہیں مجھ سے جو لکھوانا چاہیں ہے لکھوا لیں۔

کہنے لگے نہیں یہ تو تمہیں کرنا ہی پڑے گا اور جب تم لکھوا کر لاؤ گے تو میں تمہارا پاسپورٹ تمہیں دے دوں گا۔

چناں چہ میں پھر دیوبند آیا، پوسٹ ماسٹر سے لکھوایا اور پھر لکھنؤ پہنچا۔ وہاں سے پاسپورٹ حاصل کیا اور پھر وہاں سے سیدھا دلی آ گیا، جہاں والد صاحب میرا سامان لے کر پہنچ گئے تھے۔

دشواری ابھی ختم نہیں ہوئی...... اب ایک مرحلہ یہ تھا کہ ہمارے پاس انجکشن کا وہ سرٹیفکیٹ نہیں تھا جو سفر کے لئے ضروری ہے۔ ہماری تایا ابا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کے بہت تعلقات تھے مگر انہی دنوں ایک واقعہ پیش آیا تھا کہ لندن کے ہوائی اڈے سے ایسے لوگوں کو واپس کر دیا گیا تھا جن کے پاس ٹیکے کے غلط سرٹیفکیٹ تھے۔ اس لئے کوئی بھی ڈاکٹر رِسک لینے کے لئے تیار نہ تھا۔ چیچک کے انجکشن کے لئے ایک ہفتے کا وقت ضروری تھا، فلائٹ اگلے دن صبح کی تھی...... ہم مایوس ہو کر بیٹھے ہوئے تھے۔

اتنے میں قاری محمد ادریس صاحب آ گئے جو نئی دہلی کی جامع مسجد میں امام تھے، کہنے لگے کہ میرے ساتھ سفارت خانہ چلو وہاں ایک صاحب میرے جاننے والے ہیں ان سے بات کرتے ہیں۔ قاری صاحب مجھے سعودی سفارت خانے لے گئے۔ ان صاحب سے بات کی، انہوں نے کہا کہ بے فکر رہیں، سرٹیفکیٹ کا مسئلہ حل ہو جائے گا اور

یہ کل صبح کی فلائٹ سے ان شاء اللہ روانہ ہو جائیں گے۔ چناں چہ یہ سارے مرحلے طے ہوئے اور ہم اگلے دن دلی ایئرپورٹ سے بمبئ کے لئے روانہ ہوئے جہاں سے ظہران کی فلائٹ لینی تھی، اس وقت انٹرنیشنل فلائٹ بمبئ سے چلا کرتی تھی اور ظہران جاتی تھی، جدہ انٹرنیشنل ایئرپورٹ نہیں تھا۔ بمبئ سے ہمارے ساتھ حکیم اجمیری کے دو صاحب زادے سعود اور سعد بھی ہو گئے اور دوسرے کچھ ہندوستانی طلباء بھی ندوے سے آ گئے۔

ظہران ایئرپورٹ پر

ظہران ایئرپورٹ پر افسران نے ہمارے پاسپورٹ لے لئے۔ معلوم ہوا کہ ہر ایک کو پچاس ریال ایئرپورٹ فیس دینی پڑے گی تب پاسپورٹ واپس ملیں گے اور جدہ جانے والے جہاز میں سوار ہو سکیں گے۔ لوگوں کے پاس پیسے نہیں تھے، سب کے مل ملا کر بڑی مشکل سے پیسے جمع کئے مگر ہماری جیبیں خالی ہو گئیں۔

ظہران سے جدہ جانے والے جہاز میں بیٹھے تو راستے میں کچھ کھانے پینے کو نہیں دیا گیا۔ جدہ پہنچ کر وہاں کے مسافر خانے میں ٹھہرے، تھوڑے سے پیسے تھے ان سے روٹی اور فروٹ جام لے کر کھایا۔ وہاں سے مدینہ طیبہ کا جہاز ملا اور دوپہر کو جب مدینہ طیبہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ یہاں رمضان شروع ہو گیا ہے۔ ہم نے جدہ سے نہ روزے کی نیت کی تھی نہ سحری کھائی تھی، نہ ہمیں رمضان کی آمد کا پتہ تھا۔

سفر کے ایجنٹ نے بتایا کہ یہاں رمضان ہے کھانے کو کچھ نہیں ملے گا۔ اس نے چپکے سے ایک بند ہوٹل میں لے جا کر جو کچھ مل سکا کھانے کو دیا۔ کیوں کہ ہم کل سے بالکل بھوکے تھے، تھوڑا سہارا لگ گیا اور ہم مسجد نبوی میں نماز کے لئے چلے گئے۔

مدینہ طیبہ میں پہلا رمضان

مدینہ طیبہ میں ہمارا یہ پہلا رمضان تھا۔سخت گرمی تھی مگر رمضان کا جیسا لطف وہاں پایا کہیں اورنہیں آیا۔خوب دعوتیں ہوتی تھیں۔اچھے سے اچھا کھانے کوملتا تھا۔سارا دن تلاوت قرآن پاک اور ذکرواذکار میں گزرجاتا تھا۔ چند گھنٹوں کے لئے یونی ورسٹی میں جاتے تھے۔ بہت شاندار کمرے ملے ہوئے تھے۔ ہرطرح کی آسانی تھی۔لوگ با اخلاق اورملنسار تھے۔

رمضان کے آخری عشرے میں پہلا عمرہ

رمضان المبارک کے آخری عشرے میں ہم پہلی بارعمرہ کے لئے مکہ مکرمہ گئے۔ وہاں ہمارا قیام مدرسہ صولتیہ میں رہا۔اس وقت مدرسہ کے مہتمم مولانا محمد سلیم صاحب تھے جوحضرت قاری محمد طیب صاحب سے بڑا تعلق رکھتے تھے، وہ ہمارے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آئے اوراپنے پاس ٹھہرایا۔

ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس سفر سے پہلے میرے دونوں پاؤں میں سخت تکلیف تھی، پاؤں پرورم تھا سوجے ہوئے تھے۔دیوبند میں حکیم صاحب کودکھلایا توانہوں نے کہا کہ یہ بڑی موذی تکلیف کا آغاز ہے،اس کوفیل پا کہتے ہیں۔یعنی پاؤں سوج کر ہاتھی کے پاؤں کی طرح ہوجاتے ہیں، کھال پھٹنے لگتی ہے اوراس میں سے خون نکلنے لگتا ہے۔انہوں نے کہا کہ میری رائے ہے کہ اس کوسفرنہیں کرنا چاہئے۔میں نے اس پر والد صاحب سے کہا تھا کہ میں ہرحال میں ضرورجاؤں گا جوہوگا دیکھا جائے گا۔جب میں مکہ مکرمہ عمرہ کے لئے گیا تومیں نے خوب ڈٹ کرآبِ زم زم پیا اوراس کے ساتھ میں نے بیماری سے شفا کی نیت کی۔اللہ نے آبِ زم زم کی برکت سے مجھے صحت عطا فرمادی اور

کبھی پھر لوٹ کر یہ تکلیف نہیں آئی۔ زم زم کے بارے میں جو سنا تھا اس کا عملی تجربہ اور مشاہدہ مجھے خود ہوا۔ واقعی اللہ نے اس پانی میں بڑی برکت رکھی ہے اور یہ دنیا کا بہترین پانی ہے۔ اس وقت پانی پینے کا طریقہ یہ تھا کہ ایک آدمی کنویں کے پاس پائپ لئے بیٹھا رہتا تھا اور ہم ہاتھوں کی کوکھ بنا کر پانی پیا کرتے تھے۔ آس پاس بڑی پھسلن ہو جاتی تھی، احتیاط رکھنی پڑتی تھی کہ پاؤں پھسل نہ جائے۔ آج زم زم کا بہترین نظم قائم ہے۔ حرمین میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ڈرم اور گلاس رکھے ہوئے ہیں، ذرا ہاتھ بڑھاؤ اور پانی پی لو۔

اس وقت مطاف میں جو پتھر لگا ہوا تھا وہ دن میں اتنا گرم ہو جاتا تھا کہ جوٹ کے جوتے پہن کر بھی طواف کرنا مشکل ہوتا تھا۔ آج مطاف میں جو پتھر لگا ہے وہ سخت دھوپ میں بھی ٹھنڈا رہتا ہے اور طواف کرنے والوں کو کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔

غرض عمرہ کر کے ہم واپس مدینہ طیبہ حاضر ہو گئے اور عید کے بعد تعلیم کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

چھٹیوں میں شادی کا بندھن

چھٹیوں میں گھر آیا تو والدین نے شادی کر دی۔ شادی کے پندرہ دن کے بعد میں پھر چلا گیا۔ یہ شادی کا قصہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔ جب میں دارالعلوم میں پڑھانے لگا تو والدین کو میری شادی کی فکر ہوئی۔ حالاں کہ میری عمر بہت کم تھی مگر کیوں کہ بھائیوں میں سب سے بڑا تھا اس لئے والدین کی خواہش تھی کہ جلد شادی کر دی جائے۔ رشتے کی تلاش ہو رہی تھی کہ ہمارے ایک دوست نے جو دیوبند میں کتب خانہ کرتے تھے اور بڑے مال دار آدمی تھے، ان سے ذکر آیا کہ والدین میری شادی کرنا چاہتے ہیں تو انہوں

نے کہا کہ آپ میری لڑکی سے شادی کرلیں۔ان کی لڑکیاں ذرا آزادخیال اوراچھی شکل و صورت کی تھیں۔ میں نے کہا کہ میں ایک غریب آدمی ہوں میری اورآپ کی حیثیت میں بہت فرق ہے۔ وہ کہنے لگے کہ آپ اس کی فکرنہ کریں، آپ بھی کتب خانہ کرتے ہیں ، آپ کا کاروبار بڑھانے کے لئے پچاس ہزارروپے دوں گا۔اس زمانے میں پچاس ہزار کی بڑی حیثیت تھی۔

تھےتو وہ بڑے مگر دوست بھی تھے اور بے تکلف بھی۔ میں نے ہنس کرکہا کہ میں دارالعلوم میں گلستاں پڑھاتا ہوں اس میں شیخ سعدی نے اپنا ایک واقعہ لکھا ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ اندلس کی جنگ میں انگریزوں نے مجھے قیدکرلیا اور خندق کھودنے پر لگادیا۔ادھر سے ایران کا ایک بڑا تاجرآرہا تھا، اس نے مجھے اس حالت میں دیکھا تو بڑا حیران ہوا،فوج کے افسر سے جاکر بات کی کہ یہ تو ہمارے ملک کا ایک بڑا نامور ادیب اورشاعر ہے آپ نے اس کو خندق کھودنے پر کہاں لگادیا۔اس نے ایک بڑی رقم دے کر مجھے انگریز کی قید سے چھڑالیا اوراپنے گھرلے گیا۔اس کی ایک اکلوتی لڑکی تھی ، اس کے ساتھ میری شادی کردی۔ جب کبھی ہماری میاں بیوی کی لڑائی ہوتی تھی تو بیوی طعنہ دیا کرتی تھی کہ تم وہی تو ہو جسے میرے باپ نے انگریزوں کی قید سے چھڑایا تھا۔

میں کہتا تھا کہ انگریزوں کی قید سے چھڑاکر تیری قید میں دے دیا

اس کے بعد سعدی نے شعر لکھا ہے:

تونہارا زقرین بدزنہار　　　　وقنار بنا عذاب النار

یہ قصہ سن کر وہ بہت ہنسے۔ والدین نے میرا رشتہ جہاں طے کیا تھا وہ ایک یتیم لڑکی تھی ،ہم جیسے ہی معمولی حیثیت کے پڑھے لکھے لوگ تھے۔غرض کے پندرہ دن کے بعد میں چلا گیا اورتقریباً ایک سال کے بعد واپس آیا۔اللہ نے زندگی کی ساتھی اچھی دے

دی تھی، چالیس سال تک خوب نبھی۔ ۸؍جنوری ۱۹۹۹ء کو شریکِ حیات کا انتقال ہوگیا۔ یہ رمضان المبارک کا مہینہ تھا اور اٹھارواں روزہ تھا۔ میری زندگی بڑی ویران ہوگئی۔ انتقال کے بعد مجھے احساس ہوا کہ دل کے رشتے کیا ہوتے ہیں۔ وقت بہرحال ایک مرہم ہے کسی نہ کسی طرح چین آہی جاتا ہے مگر زندگی بڑی ادھوری ہوجاتی ہے۔

۱۹۷۳ء سے مالیرکوٹلہ میں قیام

۱۲؍جنوری ۱۹۷۳ء سے میرا قیام تادمِ حال مالیرکوٹلہ میں ہے۔ یہاں آنے کا قصہ بھی بڑا عجیب ہے۔

میں دارالعلوم میں پڑھاتا تھا۔ ایک مرتبہ میری خوش دامنہ نے مجھ سے کہا کہ مالیرکوٹلہ میں میرے دیور حمید حسن رہتے ہیں وہ وہاں مفتی تھے اب ریٹائر ہوگئے ہیں، وہ کہہ رہے ہیں تمہارے بارے میں کہ ان کو یہاں بھیج دو۔

میں اپنی شادی کے موقع پر حضرت مولانا مفتی حمید حسن صاحب سے مل چکا تھا بلکہ وہ تقریباً ایک ہفتہ میری سسرال میں رہے تھے اور میں ان کے پاس بیٹھا ہوا باتیں کرتا رہتا تھا۔ وہ دیوبند کے رہنے والے تھے، دارالعلوم دیوبند سے فارغ تھے۔ میرے والد صاحب کے ساتھیوں میں سے تھے اور مولانا اشرف علی تھانویؒ سے بیعت تھے۔ اس وقت وہ مجھ سے کافی مانوس ہوگئے تھے اور شاید اسی وجہ سے انہوں نے کئی بار میری خوشدامنہ سے کہا تھا کہ اس کو یہاں بھیج دو۔ وہ میرے مرحوم سسر طیب حسین صاحب کے چھوٹے بھائی تھے، ایک بڑے بھائی اختر حسین صاحب پاکستان چلے گئے تھے۔ مولانا حمید حسن صاحب کا مکان دیوبند میں سفید مسجد کے سامنے تھا اور حمید منزل کے نام سے مشہور تھا۔ رمضان کی چھٹیوں میں پھر میری خوشدامنہ جن کو میں آپا کہا کرتا تھا انہوں نے

تقاضا کیا کہ حمید تمہیں بلا رہے ہیں۔

میں نے سوچا چلو چھٹیاں ہو رہی ہیں جا کر دیکھ لیتے ہیں کیسا شہر ہے۔ میں صبح کی ٹرین سے دیو بند سے انبالہ، انبالہ سے دھوری اور دھوری سے مالیر کوٹلہ پہنچا۔ رمضان کے روزے تھے، زیادہ گرمی نہ تھی۔ مغرب کے بعد مفتی صاحب کے مکان پر آیا، ان سے ملاقات ہوئی۔ عشاء کی نماز اور تراویح ان کے ساتھ برابر کی چھوٹی سی مسجد میں پڑھی جس کا نام مسجد عارفہ ہے۔ صبح کو دس بجے کے بعد مفتی صاحب مجھے نواب افتخار علی خاں صاحب کے پاس مبارک منزل لے گئے اور تعارف کرایا۔

نواب صاحب ہم دونوں کو اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھا کر دیوان خانے لائے جہاں ان کی چھوٹی بیگم ساجدہ بیگم سے ملاقات ہوئی۔

اتفاق سے ان کے پاس شہر کے مشہور وکیل پنڈت ستراجیت بیٹھے ہوئے تھے، وہ مجھ سے اسلامی قانون کے متعلق باتیں کرنے لگے۔ یہ ایک طرح سے میرا انٹرویو ہو گیا۔ انہوں نے نواب صاحب اور بیگم صاحبہ سے میرے متعلق کچھ تعریفی کلمات کہہ دئے جوان کے دل ودماغ میں بیٹھ گئے۔ کیوں کہ ایک غیر متعلق شخص کی جو خود ماہر قانون تھا، ان کی رائے تھے اس لئے وہ اس سے بہت متاثر ہوئے اور مجھ سے کہا کہ آپ ہمارے پاس قیام کریں۔ میں نے کہا کہ میں مفتی صاحب کے پاس ٹھہرا ہوا ہوں، اگر وہ اجازت دیں گے تو میں آپ کے پاس آجاؤں گا۔ مفتی صاحب نے مجھے بخوشی اجازت دے دی اور میں دیوان خانے میں آ گیا۔

عید کے چاند کی کہانی

رمضان المبارک کی ۲۹ تاریخ ہوگئ۔ دیوان خانہ میں نواب صاحب، بیگم

صاحبہ اور میں اوپر بُرجی پر چاند دیکھنے کے لئے چڑھے مگر چاند نظر نہیں آیا اور نہ کہیں سے چاند کی اطلاع ملی۔ یہاں تک کہ عشاء کی اذان ہوگئی۔ میں نماز کے لئے تیار ہوکر جانے ہی والا تھا کہ اتنے میں ایک صاحب آئے اور کہا کہ آپ کو مفتی صاحب بلا رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں نماز کے لئے جا رہا ہوں۔انہوں نے کہا کہ نہیں ابھی بلایا ہے کوئی چاند کا معاملہ ہے۔

میں واپس لوٹا اور نواب صاحب سے کہا کہ مفتی صاحب بلا رہے ہیں کوئی چاند کی بات ہے۔نواب صاحب نے کہا آپ گاڑی میں چلے جایئے۔ میں گاڑی میں بیٹھ کر ابھی موڑ تک ہی پہنچا تھا کہ پیچھے سے بیگم صاحبہ نے دوسری گاڑی بھیجی کہ آپ واپس آجائیں ہم مفتی صاحب کو یہیں لے آتے ہیں۔

چنانچہ وہ گاڑی میں مفتی صاحب کو لے کر آ گئے۔مفتی صاحب نے میرے سامنے ایک فتویٰ رکھا کہ انیس بیس آدمیوں نے چاند کی گواہی دی ہے،تم بھی اس پر دستخط کر دو۔ میں نے کہا آپ مفتی ہیں،آپ کا فتویٰ کافی ہے میرے دستخط کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔اتنے میں کافی لوگ دیوان خانہ میں جمع ہو گئے۔ کچھ لوگ مخالفت کر رہے تھے کہ چاند نظر نہیں آیا اور کچھ لوگ خاموش تھے۔

میں نے دیکھا کہ لوگ کچھ زیادہ اعتماد نہیں کر رہے ہیں تو میں نے مفتی صاحب سے عرض کیا کہ جو گواہ ہیں آپ ان کو بلا لیں۔سب کے سامنے ان کی گواہی ہو جائے تا کہ لوگ مطمئن ہو جائیں۔مفتی صاحب نے کہا کہ یہ لوگ منتشر ہو گئے ہیں اب ان کو جمع کرنا مشکل ہو گا۔میں نے کہا کتنے مل جائیں ان کو بلا لیں۔

چنانچہ کچھ لوگ آئے۔ان کی گواہی لی گئی۔جس سے لوگ مطمئن ہو گئے اور میں نے مفتی صاحب کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اس پر دستخط کر دئے اور عید کے چاند کا

اعلان ہوگیا۔

مگر یہ بات کہ گواہوں سے پھر گواہی لی گئی غالباً مفتی صاحب کو پسند نہیں آئی۔ اُدھر بیگم صاحبہ بھی کہنے لگیں کہ آپ بھی مفتی صاحب کے چکر میں آ گئے۔ میں نے کہا کہ اگر عید کے چاند کا اعلان نہ ہوتا تو کل شہر میں دو عیدیں ہوتیں۔ ایک عید مفتی صاحب کی کہلاتی اور دوسری بیگم صاحبہ کی۔ اس لئے میں چکر میں نہیں بلکہ چکر سے نکالا ہے۔ مطلع ابر آلود تھا، اتنے لوگوں کی گواہی کے بعد چاند کو نہ ماننا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

نواب صاحب نے بھی میری تائید کی کہ آپ نے جو کیا ہے بہت ٹھیک کیا ہے اور بیگم صاحبہ بھی میری بات سے مطمئن ہوگئیں۔

اگلے روز نواب صاحب عید کے لئے مجھے اپنے ساتھ لے گئے اور نماز کے بعد اچانک انہوں نے اعلان کر دیا کہ اب یہ نئے مفتی آئندہ مفتی ہوں گے اور مجھ سے کہا کہ آپ تقریر کر دیں۔ میں نے مختصر سی تقریر کر دی اور سب لوگوں کو آنے والے مفتی صاحب کے بارے میں معلوم ہوگیا۔

عید کے دو دن کے بعد میں نے نواب صاحب سے جانے کی اجازت مانگی تو انہوں نے انگریزی میں ٹائپ کی ہوئی ایک درخواست میرے سامنے رکھ دی کہ آپ اس پر دستخط کر دیں۔

سچی بات یہ ہے کہ میں نے نواب صاحب کے کہنے پر دستخط تو کر دیئے مگر دل میں ارادہ کرلیا کہ ایسے جھگڑے کی جگہ آنے کی کیا ضرورت ہے جہاں سر منڈاتے ہی اولے پڑ گئے اور اندازہ ہوگیا کہ لوگوں کا کیا مزاج ہے۔ میں مفتی صاحب سے مل کر دیوبند آ گیا۔ چند دن بعد چھٹی ختم ہوگئی اور میں حسب معمول دار العلوم میں پڑھانے لگا۔

عیدالاضحیٰ کے قریب تقرری کا پروانہ آ گیا

تقریباً دو مہینے بعد جب کہ بقرعید کی چھٹیاں ہونے والی تھیں، یہاں سے تقرری کا پروانہ پہنچ گیا اور اس کے ساتھ ساتھ جگہ جگہ سے ایس ڈی ایم اور بیگم صاحبہ اور دوسرے لوگوں کے ٹیلی گرام آ گئے کہ میں جلد سے جلد بقرعید سے پہلے پہنچ جاؤں۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ میرا ارادہ آنے کا بالکل نہیں تھا مگر سب لوگوں نے مل کر زور ڈالا کہ چھٹی لے کر چلے جاؤ اور جا کر دیکھ لو، اگر ٹھیک نہ لگے تو واپس آ جانا۔

میں جانے سے پہلے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب سے ملنا چاہتا تھا مگر وہ کہیں سفر پر گئے ہوئے تھے، ملاقات نہ ہو سکی اور میں بقرعید سے پہلے مالیرکوٹلہ پہنچ گیا۔

مصروفیت اور ہماہمی میں وقت گزرتا رہا اور ہر چیز میرے سامنے ایک چیلنج بن کر آتی رہی...... ماحول میرے مزاج سے بالکل مختلف تھا۔ ہر بات میں نکتہ چینی، ہر چیز پر اعتراض۔ یہ سب باتیں بڑی عجیب نظر آتی تھیں۔ میں نے حضرت قاری صاحبؒ کو خط لکھا کہ آنے سے پہلے میں آپ سے مل نہیں سکا آپ سفر میں گئے ہوئے تھے، میرا دل یہاں بالکل نہیں لگتا، دارالعلوم بہت یاد آتا ہے۔آپ اجازت دیں تو میں واپس آ جاؤں۔ حضرت نے جواب میں بہت تسلی دی اور لکھا کہ اگر گئے ہو تو کچھ دن اور دیکھو واپسی میں جلدی نہ کرو۔ ان کے تسلی دینے سے دل کو سکون ہوا۔ مکان خالی ہو گیا تھا، سامان اور بچوں کو لے کر اس مکان میں چلا گیا اور اس طرح چھٹی کے دو سال گزر گئے۔

چھٹی ختم ہونے پر دارالعلوم سے خط آیا کہ تمہاری چھٹی ختم ہو رہی ہے، ہم نے تمہیں ترقی بھی دے دی ہے، اب تم فارسی کے بجائے درجاتِ عربی کے مدرس ہو، اگر واپس آنا چاہتے ہو تو آ سکتے ہو۔

میں نے اس پیش کش کو قبول کر لیا اور دارالعلوم جا کر حاضری کے دستخط کر دیئے۔

یہ شوال کا مہینہ تھا، سال کا آغاز تھا، داخلے ہو رہے تھے اور ابھی پڑھائی شروع ہونے میں پندرہ بیس دن تھے۔ میں نے ناظم صاحب سے کہا کہ مالیر کوٹلہ میں سیرت کا جلسہ ہے اگر آپ اجازت دیں تو میں اس میں شرکت کے لئے چلا جاؤں۔ انہوں نے اجازت دے دی اور فرمایا کہ جب سبق شروع ہوں گے اس وقت آجانا۔ میں اسی ارادے سے مالیر کوٹلہ گیا۔ یہاں سیرت کے جلسے میں مولانا ارشاد صاحب مبلغ دارالعلوم آیا کرتے تھے۔ انہوں نے نواب صاحب اور دوسرے لوگوں کو بتادیا کہ مفتی صاحب دیوبند واپس جارہے ہیں، ان کا نام وہاں بلیک بورڈ پر لکھا ہوا ہے کہ یہ عربی کے فلاں فلاں اسباق پڑھائیں گے۔

نواب صاحب کو معلوم ہوا تو انہوں نے بہت زیادہ اصرار کیا کہ یہاں ہمیشہ دیوبند کے علماء مفتی رہے ہیں، آپ چلے جائیں گے تو نہ جانے کون آجائے، کچھ بدعتی لوگ بھی زور لگا رہے ہیں۔

ان کے کہنے سے میں ذرا سوچ میں پڑ گیا اور میں نے والد صاحب کو ساری صورت حال سے مطلع کردیا۔

دارالعلوم میں ایک بزرگ تھے مولانا فیض الحسن کشمیریؒ۔ والد صاحب کو ان سے بہت عقیدت تھی۔ والد صاحب نے ان سے استخارے کے لئے کہا۔ انہوں نے استخارے کے بعد مجھے خط لکھا کہ حضرت قاری صاحب کے فرمانے پر میں نے معاملے میں تین دن استخارہ کیا اور تینوں دن حضرت مجدد صاحبؒ کو خواب میں دیکھا۔ انہوں نے فرمایا کہ ہم نے بلایا ہے اب واپس نہیں جانا ہے۔

ان کا یہ خط ملنے کے بعد میں نے دارالعلوم سے معذرت کرلی کہ مجھے سبکدوش کردیا جائے۔

یہ ہے قصہ یہاں کے قیام کا......ہوتا وہی ہے جو تقدیر میں لکھا ہوا ہے۔ اللہ کو یہی منظور تھا اور اس کا حکم آخری ہے اور اپنے حکم کی حکمت بھی وہی جانتا ہے۔

مخالفت کا طوفان

میں نے یہاں آنے کے بعد ایک مدرسہ تعمیر سیرت کے نام سے قائم کیا تھا...... ابتداء میں یہ مدرسہ جامع مسجد میں قائم ہوا اور اس کی کافی پذیرائی ہوئی۔ اس مدرسے میں دینی اور عصری دونوں طرح کے مضامین تھے اور باقاعدہ ایک یونیفارم ہوا کرتی تھی۔ شروع سے تعلیم کا اچھا معیار رکھا گیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ آہستہ آہستہ یہ مدرسہ پنجاب کا ایسا مرکز بن جائے کہ پنجاب کے بچے یہاں آ کر تعلیم و تربیت حاصل کریں اور پھر اپنے اپنے علاقوں میں جا کر ماحول کی اصلاح کریں۔ ظاہر ہے کہ ادارے اپنے مقصد کی طرف گامزن ہونے کے لئے وقت چاہتے ہیں، محنت اور لگن کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں یہاں صرف ملازمت کرنے کے لئے اور پیٹ پالنے کے لئے نہیں آیا تھا بلکہ میری آرزو یہ تھی کہ میں اپنی تمام صلاحیتیں تعمیر کے کام میں لگا دوں۔ اس کے لئے میں شب و روز محنت کرتا تھا اور کوشش کرتا تھا کہ لوگوں میں ایک اچھا ذوق اور جذبہ ابھرتا چلا جائے۔

میری ان تعمیری کوششوں کو کچھ لوگوں نے پسند نہیں کیا اور ان کو اپنی قیادت کے لئے خطرہ سمجھا۔ سیاسی حالات بدلتے ہی انہوں باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ مخالفت شروع کردی۔ وہ لوگ جو آپس میں ایک دوسرے سے متفق نہیں تھے وہ بھی اس بات پر جمع ہو گئے کہ جس طرح بھی ہو سکے اس مفتی کو باہر نکالو۔ یہاں تک کہ شہر کے اوباش لوگوں کو بھی اپنے ساتھ جوڑ لیا اور مخالفت کا وہ طوفان اٹھا یاہ کہ الامان الحفیظ......

ایک دفعہ کو تو میرے قدم اکھڑ گئے اور میں نے والد صاحب کو لکھا کہ حالات

بہت خراب ہیں، ان حالات میں یہاں رہنا سمجھ میں نہیں آتا۔ انہوں نے مجھے دیوبند بلایا اور فرمایا کہ حضرت مولانا آلِ حسنؒ کے پاس میرٹھ چل کر مشورہ کرتے ہیں۔

اب آپ یہ بھی سن لیجئے کہ یہ مولانا آلِ حسن کون تھے؟ مولانا آلِ حسن کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا کہ یہ پیدائشی ولی ہیں۔ حضرت قاری طیب صاحبؒ انہیں سے مشورہ کرتے تھے اور دعا کراتے تھے...... رہنے والے دیوبند کے تھے مگر قیام میرٹھ میں نواب رشید صاحب کی کوٹھی میں رہتا تھا۔ نواب صاحب ان کے اتنے گرویدہ تھے کہ اگر چندروز کے لئے مولانا دیوبند آتے تھے تو نواب صاحب فوراً دیوبند پہنچ جاتے تھے۔ ان کے ایک بیٹے ہیں طیب حسن جو الحمدللہ حیات ہیں، ایک چھوٹے بھائی تھے سید حسن ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ ان کی اہلیہ محترمہ نے مجھے بچپن میں پرورش کیا تھا، اس لئے مولانا مجھ پر بہت شفقت فرماتے تھے اور دادا صاحبؒ کی نسبت سے بہت تعلق رکھتے تھے۔

جمعہ کا دن تھا، والد صاحب مجھے لے کر میرٹھ گئے۔ شاہ پیر گیٹ کی مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھی اور جمعہ کے بعد مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے......مولانا علیل تھے، ضعف کے باوجود ہمارے پاس آکر بیٹھے۔ اباجی نے ان کو ساری صورت حال سے آگاہ کیا اور بتایا کہ یہ بہت پریشان ہیں، آپ کے پاس مشورے کے لئے آئے ہیں۔ مولانا نے ہمارے لئے چائے منگوائی، ہم برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے، فرمایا کہ آپ لوگ چائے پیجئے اور فوراً اندر کمرے میں تشریف لے گئے۔

کافی دیر کے بعد باہر آئے تو چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ میرا نام لے کر فرمایا میاں ہلال گھبراؤ مت ان شاء اللہ کامیابی ملے گی۔ رواداری میں انہوں نے ایک آدھ نام بھی لے لیا کہ کہیں وہ تو نہیں حالاں کہ وہ یہاں کسی آدمی کو جانتے نہیں تھے۔ میں نے کہا جی وہی ہے۔ فرمایا کوئی بات نہیں تمہارا مقدمہ اللہ کے یہاں پیش ہو گیا ہے بس اب تم

اپنی زبان بالکل بند کرلو، کسی کو کوئی جواب مت دو، سب اللہ پر چھوڑ دو، ان شاء اللہ وہاں سے مدد آئے گی۔

اس مادرزاد ولی کے تسلی بخش الفاظ میں ایسی تسکین تھی کہ میرا دل مضبوط ہوگیا اور پھر وہی ہوا جو انہوں نے کہا تھا۔ ایک بے سہارا بے کس آدمی جس کے پاس اتنا پیسہ بھی نہ تھا کہ وہ وکیل کی فیس دے سکے، اس کی اللہ نے غیب سے مدد کی، مخالفین کی ساری کوششیں بے کار گئیں اور اللہ نے باعزت بری کردیا۔

میں نے کامیابی کے بعد کسی سے کوئی انتقام نہیں لیا، کبھی کسی کو طعنہ نہیں دیا۔ اس صبر وِضبط کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے لوگ شرمندہ ہوئے اور انہوں نے خود محسوس کیا کہ غلطی ہماری تھی، کچھ لوگوں نے باقاعدہ معافی مانگی، کچھ لوگوں نے اپنے رویئے سے ندامت کا اظہار کیا اور کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اپنے اعمال کے ساتھ اللہ کے یہاں چلے گئے۔

مخالفت کے اس طوفان میں میرا بڑا سخت امتحان تھا...... میں نے محسوس کیا کہ میری ناتجربہ کاری اور بہت سی باتوں میں میرے مزاج کی افتاد کا بھی دخل ہے لیکن سارے فتنے کی جڑ یہ ہے کہ لوگوں کو علماء کی خودداری اور حق گوئی برداشت نہیں ہوئی، وہ چاہتے ہیں کہ یہ لوگ دبے دبے رہیں اور ہم سے مدد مانگتے رہیں۔ اللہ کا شکر ہے اس نے ایسے لوگوں کے بارِ احسان سے بچایا اور ہمیشہ استغنا کے ساتھ زندگی گزاری۔

مالیر کوٹلہ کے موجودہ حالات

مالیر کوٹلہ کے موجودہ حالات پہلے سے بہت بہتر ہیں۔ اب وہ لوگ نہیں رہے جنہوں نے جامع مسجد اور مالیر کوٹلہ کو اپنی شرارتو کا مرکز بنا رکھا تھا۔ آئے دن کوئی نہ کوئی شوشہ چھوڑتے رہتے تھے اور شہر کے ماحول میں بلاوجہ تلخی اور تناؤ پیدا ہوجاتا تھا۔

پہلے ہر جمعرات کو لوگ ختم دلاتے تھے، محلے محلے میلاد کے جلسے ہوتے تھے، شب برات پر بے پناہ آتش بازی ہوتی تھی اور اس طرح کی بہت سی خرافات تھیں جو الحمدللہ اب تقریباً ختم ہو چکی ہیں۔

مسجدوں کے امام عام طور پر اَن پڑھ میاں جی ہوا کرتے تھے، ان کے ذریعے بہت ساری بے تکی باتیں اور غلط مسئلے سماج میں پھیلتے تھے۔ اب اکثر مسجدوں میں امام حافظ، قاری، عالم ہیں۔ مسجدیں اکثر نئی بن گئی ہیں، پورے شہر میں مسجدوں کا جال پھیلا ہوا ہے اور سب مسجدیں آباد ہیں۔

میں نے اپنی حد تک کوشش کی کہ صحیح مسائل سے لوگوں کو آگاہ کیا جائے۔ پوری طرح نہ سہی کافی حد تک یہ کوشش کامیاب رہی۔ مجموعی طور پر شہر کا موجودہ ماحول کافی حد تک اطمینان بخش ہے۔

جہاں تک میرا معاملہ ہے میں اپنی تمام گھریلو ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو چکا ہوں۔ جمعہ میں درسِ قرآن کا سلسلہ الحمدللہ اب تک جاری ہے، کبھی کبھی کسی جلسے میں بھی شرکت کر لیتا ہوں اور طبیعت ٹھیک ہوتی ہے تو ہلکا پھلکا باہر کا سفر بھی کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ فتویٰ دینا اور علمی مشغلے اپنی طاقت کے مطابق جاری ہیں اور سکون و اطمینان کے ساتھ مطالعے میں اور ہلکی پھلکی کتابیں لکھنے میں اپنا وقت خرچ کر لیتا ہوں۔ اللہ اخلاص کے ساتھ دین کی خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔ تقریروں کا اچھا خاصا ذخیرہ ہے جو مرتب ہو رہا ہے، معلوم نہیں میری زندگی میں شائع ہو سکے گا یا نہیں...... میرے بیٹے طارق عمیر عثمانی بڑے ذوق و شوق اور محنت سے ان کاموں میں لگے ہوئے ہیں، اللہ نے ان کو بڑی صلاحیتوں سے نوازا ہے...... مالیر کوٹلہ میں رہ بھی کو انہوں نے دارالسلام کے کاموں کو ملک بھر میں پھیلا دیا ہے اور الحمدللہ اس سے سینکڑوں ہزاروں لوگ استفادہ کر رہے ہیں اور یہ

ادارہ ملت کے نونہالوں کے لئے ترقی کی راہیں ہموار کرنے میں مصروفِ عمل ہے۔ مالیرکوٹلہ میں مجھ پر جو حالات گزرے ان کا سب سے زیادہ اثر طارق عمیر کے دل و دماغ پر پڑا اور وہ شہر کے ماحول سے کبھی مانوس نہ ہو سکے......اس بات سے مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے کہ ان کی صلاحیتیں اس شہر کے اندھیروں میں گم ہو رہی ہیں۔ اللہ ان کی حفاظت فرمائے اور ان کی عمر میں برکت عطا فرمائے۔

یہ ہے اپنی زندگی کی مختصر سی داستان اور تلخ و شیریں ایام کی کچھ یادیں......

ایک کہانی ہے زندگی ہے اپنی

اور کیا بے مزا کہانی ہے

چلتے چلتے جو بات اپنے عزیز و اقربا، دوستوں ساتھیوں اور جاننے والوں سے بہت عاجزی کے ساتھ حرف آخر کے طور پر عرض کرنی ہے وہ یہ ہے کہ مجھ سے کسی کی شان میں اگر کوئی گستاخی ہوگئی ہو، میں نے کسی کی دل آزاری کی ہو، میری کوئی بات کسی کو ناگوار گزری ہو، کسی کا کوئی حق میرے ذمے ہو تو وہ اللہ کے لئے مجھے معاف کر دے اور حساب کے دن پر معاملہ نہ رکھے......میں اپنی طرف سے سب کو بلا شرط ہر بات معاف کرتا ہوں اور کسی سے میرا کوئی کسی طرح کا مطالبہ نہیں ہے......وقت بہت تیزی سے گزر رہا ہے، نہ جانے کس وقت روانگی کا وقت آجائے...... چراغِ سحر ہے بجھا چاہتا ہے۔ ضعفِ پیری بار بار کہہ رہا ہے کہ اب مہلت زیادہ نہیں ہے۔

سرآمدروزگارِ ایں فقیرے

دگر دانائے راز آید کہ نہ آید